انسانی تماشا

ولیم سیروین
شفیق الرحمن

انسانی تماشا

شفیق الرحمٰن

والدہ ماجدہ طلٰی سروَین کے نام

بہت دِنوں سے خواہش تھی کہ آپ کے لیے ایک کہانی لکھوں جو بہت اچھی ہو، میری سب کہانیوں سے اچھی۔ مجھے کُچھ دیر انتظار کرنا چاہیے تھا۔ لیکن کسی کو علم نہیں کہ آئندہ کیا ہو گا، بدلے ہوئے حالات کا ذوق و شوق پر کیا اثر پڑے گا۔ چنانچہ میں نے اسے جلدی میں مکمل کیا ہے۔ اپنے موجودہ شعور اور رجحان کے مطابق۔

مجھے امید ہے کہ عنقریب کوئی ماہر اس کا ترجمہ آرمینی زبان میں کرے گا۔ اور یہ ترجمہ اصل سے بہتر ہو گا۔ جیسا کہ آپ نے بارہا کیا ہے، آپ اس کے کچھ حصّے مجھے پڑھ کر ضرور سُنائیں گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بڑے شوق سے سنوں گا اور اپنے مادری زبان کی حلاوت سے لُطف اندوز ہوں گا، یہ زبان جس سے بہت کم لوگ مانوس ہیں۔ اسے آپ سے زیادہ کوئی پسند نہیں کرتا۔ چونکہ آپ کو انگریزی اچھی طرح نہیں آتی اور مَیں آرمینی زبان سے ناآشنا ہوں، اس لئے کوئی اچھا مترجم یہ مشکل ضرور حل کر دے گا۔

یہ کہانی آپ کے لیے ہے، مُجھے امید ہے آپ اسے پسند فرمائیں گی، میرا اسلوبِ تحریر سادہ ہے، اس میں سنجیدگی اور لااُبالی پن کا وہ امتزاج موجود ہے جو آپ کی طبیعت میں

ہے، جو ہمارے کُنبے کا خاصہ ہے۔ شاید یہ کہانی اتنی اچھی نہ ہو لیکن مُجھے اس کی پروا نہیں، آپ کو یقیناً اچھی معلوم ہو گی کیونکہ اسے آپ کے بیٹے نے لکھا ہے۔

ولیم سروَین

فہرست

اس کہانی کے کردار

یولی سیز میکالے	ایک بھولا بھالا بچّہ
مسز میتھیو میکالے	بہت اچھے بچّوں کی والدہ
ہومر میکالے	ایک خیر خواہ
مسٹر سپنگلز	تار گھر کا فیاض مینجر
مسٹر گروگن	دنیا کا بہترین تار بابو
بیس میکالے	خوبصورت لیکن الھڑ لڑکی
میری ایرینا	پڑوس کی ایک دوشیزہ
مسز روزا اسینڑوَل	جسے شعبۂ جنگ نے بُری خبر بھیجی
استاد بائی فیلڈ	جس سے ہومر کو ضد ہو

مس ہکس	تاریخِ قدیم اور انسانیت کی لیکچرار
ہیلن ایلیٹ	ہومر کی بے نیاز محبوبہ
موٹا کرِس	ایک انسان دوست شکاری
ایگی گوٹلیب	خوبانی چور گروہ کا سرغنہ
ڈائنا سٹیڈ	سپنگلز کی محبوبہ
کاربٹ	میخانے کا مالک

یولی سیز

کیلیفورنیا کے قصبے اتھیکا میں، ایک چھوٹا سا لڑکا، جس کا نام یولی سیز میکالے تھا اپنے مکان کے پچھواڑے گلہریوں کے بِل کے پاس کھڑا تھا۔ گلہری نرم نرم مٹی نکال کر باہر پھینک رہی تھی اور کبھی کبھی جھانک کر لڑکے کی طرف دیکھتی جو اجنبی تو تھا لیکن دشمن نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اتنے میں ایک پرندہ کہیں سے آ گیا اور اخروٹ کے پرانے درخت پر آ بیٹھا۔ پرندے نے نغمہ سرائی شروع کی تو لڑکا سب کچھ بھول گیا اور اُوپر دیکھنے لگا۔

یکایک ریل گاڑی کے آنے کا شور سنائی دیا، ساتھ ساتھ زمین بھی کانپ رہی تھی، لڑکا ریل کی پٹڑی کی طرف سرپٹ بھاگا۔ اس نے گزرتے ہوئے انجن کے ڈرائیور کو سلام کیا۔ لیکن ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔ مال گاڑی کے ڈبّوں میں جو پانچ چھ آدمی نظر آئے اس نے سب کو باری باری سلام کیا۔ اگرچہ انہوں نے لڑکے کو دیکھ لیا تھا لیکن کسی نے کوئی توجہ نہ کی۔

آخر ایک کھُلے ہوئے ڈبّے میں ایک حبشی دکھائی دیا جو گا رہا تھا۔ کھڑ کھڑاہٹ اور شور کے باوجود اس کا گانا سنائی دے رہا تھا۔

”مری محبوب مت آنسو بہا تو

وطن اپنا پرانا کینٹکی ہے

کچھ اس پیارے وطن کے گیت گا تو“

یولی سیز نے اسے سلام کیا اور ایک نہایت عجیب اور غیر متوقع بات ہوئی۔ یہ شخص جو بالکل سیاہ تھا اور دوسروں سے مختلف تھا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے چلایا۔

”لڑکے! میں اپنے گھر جا رہا ہوں، اپنے وطن جہاں کا میں ہوں۔“

لڑکا اور حبشی ایک دوسرے کی طرف ہاتھ ہلاتے رہے۔ حتیٰ کہ مال گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

لڑکے نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاروں طرف بڑی تنہائی، بڑی مضحکہ خیز دنیا تھی۔

عجیب کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی، حیرت انگیز، بے معنی، حسین دنیا۔

وہ چل پڑا۔ راستے میں ایک بوڑھا ملا جس نے کمر پر کچھ اُٹھا رکھا تھا۔ لڑکے نے اسے بھی سلام کیا۔ وہ عمر رسیدہ اور تھکا ہوا تھا۔ اسے ایک بچّے کا اظہارِ دوستی قابلِ توجہ نہ معلوم ہوا۔ اس نے ایسی نظروں سے یولی سیز کو دیکھا جیسے وہ دونوں کبھی کے مر چکے ہوں۔

لڑکا آہستہ آہستہ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ٹرین کا شور گونج رہا تھا اور حبشی کا گانا۔ اور اس کا فقرہ۔ ”لڑکے میں گھر جا رہا ہوں اپنے وطن جہاں کا میں ہوں۔“

وہ ایک درخت کے نیچے رُک گیا۔ زرد رنگ کا بڑا سا پھل زمین پر پڑا تھا۔ اسے ٹھوکر لگائی اور مسکرانے لگا۔ یہ مسکراہٹ میکالے کُنبے کی مخصوص مسکراہٹ تھی، حلیم بردبار، مخفی مسکراہٹ۔ جو بیشتر باتوں کے لیے ہاں کے معنی رکھتی تھی۔

موڑ سے ذرا آگے ان کا گھر تھا۔ گھر نظر آیا تو یولی سیز مسرّت سے اچھلنے لگا۔ ایک دفعہ جو اُچھلا ہے تو دھڑام سے گرا۔ مگر جلدی سے اُٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کی ماں احاطے میں مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اس نے لڑکے کی اُچھل

کو د دیکھ لی تھی۔ یولی سیز چپکے سے ماں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ پھر مرغیوں کے ڈربے میں انڈے تلاش کرنے گیا۔ اسے ایک انڈہ مل گیا جو اس نے بڑی حفاظت سے اُٹھا کر ماں کے حوالے کیا، ایسے انداز سے جس کا سمجھنا بڑوں کے لیے مشکل ہے اور بچے جسے بھول جاتے ہیں۔

ہومر

کچی سڑک دھول سے اَٹی پڑی تھی لیکن اس کا بڑا بھائی ہومر بڑی مستعدی سے پرانی سائیکل چلا رہا تھا۔ اس نے تار کے ہرکاروں کا کوٹ اور ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کوٹ بہت بڑا تھا اور ٹوپی چھوٹی۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ فضا میں سکون تھا اور غنودگی۔ جو اتھیکا کے باشندوں کو بے حد عزیز ہے۔

چاروں طرف کیلیفورنیا کا پرانا علاقہ تھا اور خوشنما کُنج اور تاکستان۔ وہ بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ تاہم گرد و نواح کے حسین نظاروں سے بے خبر نہ تھا۔ کبھی وہ گھاس کے قطعوں پر پھیلی ہوئی دھوپ کو دیکھتا کبھی نیلے آسمان کے سفید بالوں کو۔ سیدھا جانے کی بجائے فرطِ مسرّت سے وہ سائیکل کو لہریوں میں چلا رہا تھا۔ پیڈل کی گردش کے ساتھ ساتھ وہ گانے لگتا۔ یہ گیت بیک وقت سادہ، غنائیہ، مُہمَل سب کچھ تھے لیکن ان میں دلکشی تھی۔ ان میں سے بیشتر گیت اس نے اوپرا میں سُنے تھے۔ آرکسٹرا کی دُھنیں تھیں جنہیں اس نے بارہا اپنی بہن بیس کے پیانو پر اور ماں کے بربط پر گایا تھا۔ بعد میں اس کا بڑا بھائی مارکس آرگن باجا

لے آیا، جس سے کبھی طربیہ نغمے نکلتے تھے کبھی مغموم۔ اسے مارکس یاد آنے لگتا۔ یکایک اسے شور سُنائی دیا اور آسمان میں تین چیزیں تیزی سے اُڑتی ہوئی گزر گئیں۔ ہرکارے نے ان کی طرف دیکھا اور فوراً ایک کھائی میں جا گھسا۔

"یہ ہوائی جہاز تھے۔" اس نے زیرِ لب کہا۔

کسی زمیندار کا کتّا غُل سُن کر بھاگا بھاگا آیا اور اس طمطراق سے بھونکنے لگا جیسے کوئی بات کہنا چاہتا ہے۔ ہرکارے نے ہشت ہشت کر کے اسے چُپ کرایا اور جلدی سے سائیکل پر سوار ہو کر چل دیا۔

ذرا سی دیر میں آبادی آگئی۔ مکانوں کی قطار سے پہلے ایک بورڈ لگا ہوا تھا، جس پر لکھا تھا:

اتھیکا کیلیفورنیا۔

مشرق ہو یا مغرب وطن پھر وطن ہے۔

اے اجنبی خوش آمدید!

سامنے سے فوجی لاریاں آرہی تھیں، اس لیے وہ رُک گیا۔ اس نے سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے چھوٹے بھائی نے

انجن ڈرائیور اور دوسروں کو سلام کیا تھا۔ کئی سپاہیوں نے سلام کا جواب دیا۔

تار گھر

جب ہومر تار گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ کلاک میں سات بج کر دو منٹ ہو چکے تھے۔ تار گھر کا مینجر سپنگلز ایک تار کے الفاظ گِن رہا تھا۔ سامنے ایک بیزار سا بیس سالہ نوجوان کھڑا تھا۔ ہومر ان دونوں کی باتیں سُننے لگا۔

"کُل چودہ الفاظ ہوئے۔" سپنگلز بولا۔ پھر نوجوان کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

"میاں خرچ کی تنگی تو نہیں؟"

نوجوان جواب میں بولا۔ "جی ایسا ہی ہے لیکن میری امّی بھیج دیں گی اور میں آسانی سے گھر پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن تم پھرتے کہاں رہے؟"

"جی کسی خاص جگہ تو نہیں گیا۔" نوجوان کھانسا۔

"امّی کو یہ تار کتنی دیر میں مل جائے گا؟"

"مشرقی حصّوں میں رات ہو چکی ہو گی۔ اتنی دیر گئے رقم فراہم کرنا شاید مشکل ہو۔ ویسے یہ تار میں ابھی بھیج دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر سپنگلز نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کیں اور مٹھی بھر سِکّے اور ایک اُبلا ہوا انڈا نکال کر سامنے رکھ دیا۔

"یہ لو شاید ضرورت پڑ جائے۔" اس نے نوجوان کے ہاتھ میں سِکّے تھما دیئے۔

"جب تمہاری امّی بھیجیں گی تو لوٹا دینا۔" پھر انڈے کی طرف اشارہ کر کے بولا:

"چھ سات دن ہوئے میں نے یہ ایک دکان سے اُٹھا لیا تھا۔ اُبلے ہوئے انڈے کو میں خوش نصیبی کی علامت سمجھتا ہوں۔"

"جی یہ سِکّے؟" نوجوان حیران سا ہو گیا۔

"لے لو۔ ٹھیک ہے۔"

"شکریہ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" اس نے جلدی سے کہا اور باہر نکل گیا۔ سپنگلز نے تار مسٹر گروگن کو دے دیا۔

"تار ابھی بھیج دو۔ اس کی لاگت میں دوں گا۔"

گروگن نے تار کی مشین کو حرکت دی اور الفاظ دوہرانے لگا:۔

”مسز مارگریٹ سٹرکمین

۱۸۷۴ ابڈل سٹریٹ۔ یارک۔ پنسلوینیا

امّی جان بتیس ڈالر بذریعہ تار بھجوا دیجئے۔ میں گھر آنا چاہتا ہوں۔ باقی سب خیریت ہے۔

جان۔“

ہومر کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ اگر کچھ تار بانٹنے ہوں تو لے کر تقسیم کر آئے۔ سپنگلز کی نگاہیں لڑکے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ہرکارے کا کام تمہیں پسند آیا؟“

”جی بہت پسند آیا۔ طرح طرح کے آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ نئی نئی جگہیں دیکھنے میں آتی ہیں۔“

”بہت خوب! یہ بتاؤ کہ رات کو اچھی طرح سوئے تھے؟“

”جی ہاں! میں تھک گیا تھا لیکن نیند خوب آئی۔“

”آج سکول میں تو نہیں اونگھے؟“

"تھوڑا سا اونگھا تھا۔"

"کون سے لیکچر میں؟"

"تاریخِ قدیم کی کلاس میں۔"

"اور کھیل کود؟ اس نئے کام کی وجہ سے اب کھیل تو نہ سکو گے؟"

"جی نہیں، ضرور کھیلوں کا سکول میں ایک گھنٹہ ورزش کا بھی ہوتا ہے۔"

"اچھا؟ میں خود دو سو بیس گز کی دوڑ میں اس علاقے کا چمپئین رہ چکا ہوں۔ سچ بتاتا، واقعی تمہیں یہ نوکری پسند ہے؟"

"میں اس علاقے کا سب سے تیز ہرکارہ بن کر دکھاؤں گا۔"

"شاباش! مگر اس کوشش میں کہیں اپنے آپ کو ہلاک نہ کر بیٹھنا۔ تم میں تیزی بہت ہے۔ جہاں پہنچنا ہو جلدی پہنچنا لیکن ضرورت سے زیادہ تیزی نہ دکھانا۔ سب سے نرمی سے پیش آؤ۔ بجلی کی لفٹ میں ٹوپی اتار لیا کرو اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ تار کا فارم کبھی گم نہ کرو۔"

"بہت اچھا جناب۔"

”رات کا کام دن کے کام سے مختلف ہوتا ہے۔ چینیوں کے محلّے یا مضافات میں جاتے ہوئے سب ڈرتے ہیں۔ تم کبھی مت ڈرا کرو۔ یہ لوگ اتنے بُرے نہیں ہوتے۔ ان سے کبھی مت گھبراؤ۔ تمہاری عُمر کیا ہے؟“

”سولہ برس۔“

”تم نے کل بھی یہی بتایا تھا۔ قاعدے کے مطابق ہمیں سولہ برس سے کم لڑکوں کو ملازم نہیں رکھنا چاہیے۔ لیکن ہم تمہیں رکھ لیں گے۔ کیا ہے تمہاری عمر؟“

”چودہ برس۔“

”چلو دو برس میں سولہ کے ہو جاؤ گے۔“

”جی ہاں۔“

”اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لیا کرو۔“

”جی جو تار گا کر دینے ہوتے ہیں ان کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”وہ یونہی ہوتے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ ایک تو ایسے تار یہاں بہت کم آتے ہیں۔ دوسرے تمہاری آواز اچھی خاصی ہے۔“

”میں اتھیکا کے مذہبی سکول میں گایا کرتا تھا۔“

”تب تو اور بھی اچھا ہے۔ اس قسم کے تاروں کے لیے ایسی ہی آواز کی ضرورت ہے۔ اب فرض کرو کہ مسٹر گروگن کو سالگرہ پر مبارک باد کا تار آیا ہے۔ یہ پیغام کس طرح پہنچاؤ گے ؟“

ہومر، گروگن کے پاس جاکر گانے لگا۔

”سالگرہ مبارک ہو

سالگرہ مبارک ہو

سالگرہ مبارک ہو عزیز گروگن

سالگرہ مبارک ہو۔“

”شکریہ۔“ گروگن نے کہا۔

”شاباش۔“ سپنگلز بولا۔ ”مگر عزیز گروگن کی جگہ تمہیں عزیز مسٹر گروگن کہنا چاہیے تھا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ پندرہ ڈالر فی ہفتہ جو ملیں گے ان کا کیا کروگے ؟“

”اپنی والدہ کو دوں گا۔“

”بہت خوب، آج سے تم اس تار گھر کے ایک اہم رکن ہو۔ ہوشیاری سے کام کرنا۔ ہر بات توجّہ سے سُننا۔ ہر چیز کو غور سے دیکھنا۔“

”جی ایسا ہی ہو گا۔“

”اور آئندہ کے لئے کیا ارادے ہیں؟“

ہومر خاموش ہو گیا۔ وہ ہمیشہ مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ ہر لمحہ، ہر روز، خواہ یہ آنے والی کل کے متعلق کیوں نہ ہو۔

”جی پتہ نہیں آئندہ کیا ہو گا۔ شاید ایک دن کچھ نہ کچھ بن ہی جاؤں گا۔ نغمہ نگار یا کچھ اور۔“

”تب تو تمہارے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہاں نغمے ہی نغمے ہیں۔ نغمے جو لوگوں کے دلوں سے نکلتے ہیں۔ تار کی مشین کی موسیقی سُنو۔ کتنی دل آویز ہے!“

”جی ہاں۔“

”بڑی سڑک پر تم نے نانبائی چیسٹر ٹن کی دکان دیکھی ہے؟ یہ سِکّے لو، دو میٹھے سموسے لے آؤ۔ سیب، ناریل اور بالائی کے بڑے سے سموسے۔ باسی لانا، وہ

سستے ہوتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔"

ہومر سکّے لے کر باہر بھاگا۔ سپنگلز اسے دیکھتا رہا۔ وہ خود کچھ سوچ رہا تھا۔ زندگی کی خوشگوار اور مسرور کن چیزوں کے متعلق۔ جب چونکا تو گروگن سے کہنے لگا۔

"اس لڑکے کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"اچھا لڑکا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ شریف خاندان کا ہے۔ یہ لوگ غریب ہیں۔ سانتا کلارا سڑک پر رہتے ہیں۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ بھائی فوج میں ہے۔ ماں چھوٹے موٹے کام لیتی ہے۔ بہن کالج میں پڑھتی ہے۔ ویسے یہ لڑکا ذرا کم عمر ہے بس۔"

"اور میں عمر رسیدہ ہوں۔" گروگن بولا۔ "ہم دونوں کی خوب گزرے گی۔"

سپنگلز اٹھا۔ "اچھّا میں جاتا ہوں۔ اگر میری ضرورت ہوئی تو کاربٹ کی دکان سے بُلا لینا۔ سموسے تم دونوں کھا لینا۔"

سپنگلز نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ ہومر سموسے لے کر آ گیا۔

''کیانام بتایا تھا تم نے اپنا؟'' سپنگلز نے متحیر ہو کر پوچھا۔

''ہومر میکالے۔''

سپنگلز نے ازراہِ شفقت اپنا بازو اس نئے ہرکارے کے کندھے پر رکھ دیا۔

''ہومر میکالے۔ اس تار گھر کو تم ہی جیسے لڑکے کی ضرورت تھی۔ میرے خیال میں سان جاکن کی وادی میں تم سب سے تیز رفتار ہو۔ کسی دن تم بڑے آدمی بنو گے۔ اگر تب تک زندہ رہے، اس لیے ذرا اپنا خیال رکھا کرو۔''

سپنگلز دفتر سے چلا گیا۔ ہومر یہ سوچ رہا تھا کہ اس فقرے کا مطلب کیا تھا۔

''لڑکے وہ سموسے کہاں ہیں؟'' گروگن نے پوچھا۔

ہومر نے کاغذ میں لپٹے ہوئے سموسے میز پر رکھ دیئے۔

''برخوردار میرا نام ولیم گروگن ہے۔ مجھے لوگ بچّوں کی طرح ولی کہتے ہیں، گو میں ہوں سڑسٹھ برس کا۔ میں پرانا تار بابو ہوں۔ ان کے علاوہ رات کو بھی تار گھر کا محافظ میں ہی ہوتا ہوں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ بدلتی دنیا کی بہت سی کیفیتیں دیکھی ہیں اور اس وقت مجھے بھوک بھی لگی ہوئی ہے۔ آؤ۔ سموسے کھائیں۔ آج سے ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

"جی ہاں، جناب؟"

بوڑھے نے ایک سموسے کو چار حصّوں میں تقسیم کیا اور دونوں اس پر لگی ہوئی بالائی کھانے لگے۔

"تمہیں کبھی کبھی میرے کام بھی کرنے ہوں گے۔ مثلاً میرے ساتھ گانے میں شریک ہونا پڑے گا۔ پاس بیٹھ کر باتیں کرنی ہوں گی۔ جب میں زیادہ شراب پیئے ہوں گا تو مجھے تم سے اس سمجھ بوجھ کی توقع ہو گی جس کے لئے تم ابھی نو عُمر ہو۔ کیا عمر ہے تمہاری؟"

"چودہ برس کا ہوں۔ لیکن میں سمجھ جاؤں گا۔"

"شاباش۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ ہر رات تمہیں یہ خیال رکھنا ہو گا کہ میں دفتر میں اپنے فرائض سے غفلت تو نہیں برتتا۔ اگر میں اونگھنے لگوں تو پہلے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اور اگر جھنجھوڑنے پر بھی بیدار نہ ہوں تو پھر جلدی سے کاربٹ کی دکان سے بغیر دودھ کی گرم گرم کافی کا ایک پیالہ۔"

"بہت اچھا۔"

"اگر دفتر سے باہر کہیں مجھے پڑے ہوئے دیکھو تو کوئی پروانہ کرنا۔ بس سلام کر

کے گزر جانا۔ کوئی سوال مت پوچھنا۔ ایسے وقت میں بہت حساس ہو جاتا ہوں۔"

"دفتر میں سرد پانی کے چھینٹے اور گرم کافی اور سڑک پر فقط سلام۔"

گروگن نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بڑا سا لقمہ لے کر بولا۔ "کیا خیال ہے تمہارا؟ جنگ کے بعد یہ دنیا کچھ بہتر ہو جائے گی؟"

"جی ہاں۔"

"تمہیں ناریل کے سموسے پسند ہیں؟"

"جی ہاں۔"

تار کی مشین کھٹر کنے لگی۔ گروگن مشین کے پاس جا بیٹھا۔

"مجھے بھی ناریل کے سموسے پسند ہیں۔ مجھے موسیقی بھی پسند ہے۔ میں گاتا بھی ہوں۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ سکول میں گایا کرتے تھے۔ سکول کا کوئی گانا سُناؤ۔ میں اتنے میں واشنگٹن کا یہ تار وصول کرتا ہوں۔"

ہومر گانے لگا۔ گروگن نے تار کے الفاظ ٹائپ کیے۔ یہ تار مسز روزا سیڈول کے

نام تھا۔ شعبۂ جنگ نے یہ خبر بھیجی تھی کہ مسز اسپڈول کا لڑکا لڑائی میں مارا گیا۔

گروگن نے تار ہومر کے حوالے کیا اور میز کی دراز سے بوتل نکال کر چند گھونٹ لیے۔ ہومر نے تار لفافے میں بند کر کے مہر لگائی اور لفافہ اپنی ٹوپی میں رکھ کر روانہ ہو گیا۔

بوڑھے نے اونچی آواز میں ہومر کا گایا ہوا گیت گانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ بھی جوان تھا۔

دنیا مجھ پر رشک کرے گی

سانتا کلارا سڑک پر میکالے کُنبے کے گھر سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ مسز میکالے اور بیس مشہور گیت "دنیا مجھ پر رشک کرے گی" گا رہی تھیں۔ یہ گیت مارکس کے لیے تھا جو کہیں دور تھا۔ اسے یہ گیت بہت پسند تھا۔

پڑوس سے میری ایرینا آ گئی اور پیانو کے پاس کھڑی ہو کر گانے لگی۔ وہ بھی یہ گیت مارکس کے لیے گا رہی تھی جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ چھوٹا بچّہ یولی سیز چپ چاپ سُن رہا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ ضرور کوئی بات ہے جو اس سے چھپائی جا رہی ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ بات کیا ہے حالانکہ وہ تقریباً اونگھ رہا تھا۔

گیت ختم ہوا تو اس نے اپنی ماں سے پوچھا۔ "بھائی مارکس کہاں ہے؟"

مسز میکالے بولی۔ "بیٹے کچھ خود بھی سمجھ لیا کرو۔"

یولی سیز نے سمجھنے کی کوشش کی لیکن سوچنے لگا کہ کیا سمجھے۔

”کیا سمجھوں؟“

”یہی کہ مارکس یہاں سے جا چکا۔“

”کہاں؟“

”وہ فوج میں ہے۔“

”تو وہ گھر کب آئیں گے؟“

”جب جنگ ختم ہو گی۔“

”کل؟“

”نہیں کل نہیں۔“

”تو پھر کب؟“

”یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔“

”ابّا جان کہاں ہیں؟ ہم انتظار کریں تو کیا وہ بھی آسکتے ہیں۔ مارکس کی طرح؟“

”نہیں وہ اس طرح نہیں آئیں گے جیسے سیڑھیاں اور دالان طے کر کے کبھی آیا

کرتے تھے۔"

بچّے کے لیے اتنی بات سمجھنا بہت مشکل تھا۔ فقط ایک لفظ رہ گیا تھا جس کا استعمال کچھ مدد دے سکتا تھا۔ اس نے یہی لفظ بول دیا۔

"وہ کیوں؟"

مسز میکالے نے بیس اور میری کی طرف دیکھا اور کہا۔ "موت ایسی چیز نہیں جسے ہر ایک سمجھ سکے، خصوصاً ایک چھوٹا بچّہ۔ لیکن ہر جاندار نے ایک دن فنا ہو جائے گی۔"

وہ یولی سیز سے مخاطب ہوئی۔ "وہ دن تمہارے ابّا کے لیے دو سال پہلے آیا تھا۔ مگر جب تک ہم زندہ ہیں اور اکٹھے ہیں خواہ ہم میں سے صرف دو افراد ہی رہ جائیں جو انہیں یاد رکھتے ہوں اس وقت تک دنیا کی کوئی طاقت انہیں ہم سے نہیں چھین سکتی۔ ان کا جسم فنا ہو سکتا ہے لیکن وہ خود فنا نہیں ہو سکتے۔ جوں جوں تم بڑے ہو گئے اپنے ابّا کو زیادہ اچھی طرح جاننے لگو گے۔ وہ مرے نہیں اس لیے کہ تم زندہ ہو۔ وقت، حادثہ، بیماری اور تھکاوٹ۔ ان سب نے ان کا جسدِ خاکی ہم سے چھین لیا لیکن پھر انہیں تمہارے روپ میں واپس لوٹا دیا۔ اس روپ میں جو کہیں نوعمر ہے۔ شاید تم یہ باتیں نہ سمجھ سکو، لیکن یہ یاد رکھنا کہ کوئی اچھی چیز

کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں انسان نہ رہتے، زندگی نابود ہو چکی ہوتی۔ مگر دنیا میں آبادی بھی ہے اور زندگی بھی۔"

بچّہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اچانک اسے صبح کی بات یاد آگئی۔

"امّی گلہریاں کیا ہوتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

اس سوال پر امّی کو ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ لڑکے میں تجسس کا مادہ ہے۔ یہ جذبہ اس کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ اس کے دل میں ولولے ہیں۔ محبت ہے۔ کسی ایک چیز کے لیے نہیں بلکہ ہر چیز کے لیے۔

"زمیں کی گلہریاں ان کے پرندے اور سمندر کی مچھلیاں، کائنات کے اجزا ہیں۔ ہماری زندگی کے حصّے ہیں۔ ہر چیز جو سانس لیتی ہے وہ ہمارا ایک جزو ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں جو ہماری طرح متحرک ہیں وہ بھی ہمارا جزو ہیں۔ سورج، زمین، آسمان، تارے، دریا اور سمندر۔ یہ سب ہمارے شریک ہیں۔ ہمیں دنیا میں بھیجا گیا ہے تاکہ ہم ان سے لطف اندوز ہوں اور خدا کا شکر بجالائیں۔"

بچّے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اچھا یہ تو بتایئے کہ ہومر کہاں ہے؟"

"تمہارا بھائی ہومر کام پر گیا ہے۔ کل سے اس نے ملازمت کرلی ہے۔ سکول کے

بعد وہ نوکری پر چلا جاتا ہے اور آدھی رات کو آتا ہے۔ تم اس وقت بستر میں ہوتے ہو۔"

بچّے کی سمجھ میں نہ آیا کہ کام کیا ہوتا ہے اس کا بھائی ملازمت کیوں کر رہا ہے، ملازمت سے انسان کو کیا لُطف حاصل ہو سکتا ہے؟

"ہومر نوکری کیوں کر رہا ہے؟"

دونوں لڑکیاں بھی خاموشی سے ماں بیٹے کی گفتگو سُن رہی تھیں۔

مسز میکالے بولی۔ "ہومر اس لیے ملازم ہوا کہ تمہارا بڑا بھائی مارکس فوج میں ہے۔ ہمیں رقم کی ضرورت ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے خریدنے کے لیے۔ مکان کا کرایہ ادا کرنے لیے اور دوسروں کو دینے کے لیے جن کی ضروریات زیادہ اہم ہیں۔"

"وہ کون ہیں؟"

"بہت سے لوگ جو غریب ہیں، ضرورت مند ہیں۔"

"غریب کون ہوتے ہیں؟"

"ہر ایک غریب ہے۔" مسز میکالے مسکرانے لگی۔

یولی سیز اب بالکل اُونگھ رہا تھا۔ اس نے ماں کی طرف متوجّہ رہنے کی کوشش کی مگر نہ رہ سکا۔

"بیٹے دوسروں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ دوسروں کو اپنی توفیق سے زیادہ دینا چاہیے۔ اس نیک کام میں فضول خرچی بھی جائز ہے۔ جو شخص تمہاری زندگی میں آئے اس کی مدد کرو۔ کوئی تمہیں دھوکہ نہیں دے سکے گا۔ اگر تم نے چور کو کچھ دے دیا تو وہ تمہاری چوری نہیں کرے گا۔ جتنا تم نے دوسروں کو دیا ہے اس سے کہیں زیادہ تمہیں مل جائے گا۔"

مسز میکالے نے بچّے کی طرف دیکھا اور بیس سے کہا۔ "اسے بستر میں لٹا دو۔"

بیس اور میری اُسے اٹھا کر لے گئیں۔ مسز میکالے تنہا بیٹھی تھی۔ یکایک قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے میتھیو میکالے کو جیتا جاگتا دیکھ رہی ہو۔

"میں سو گیا تھا۔ مجھے نیند آرہی تھی۔ کیٹی مجھے معاف کرنا۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ یہ ہنسی بالکل یولی سیز کی ہی کی طرح تھی۔ بیس واپس آگئی اور

بولی۔

”بستر پر لِٹانے سے پہلے ننھا ہنسا تھا؟“

تمہارا راستہ الگ میر ا راستہ الگ

ہر کارے نے مسز روز اسیڈول کے مکان کے سامنے سائیکل روک لی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن اسے یقین سا ہو گیا کہ اندر کوئی ہے۔ شاید روز اسیڈول ہی ہو۔ وہ بد نصیب عورت جسے دنیا میں ایک اور قتل کی خبر ملنے کو ہے، جس کی چوٹ اسی کے کلیجے پر لگے گی۔

پھر جیسے آہٹ ہوئی آہستہ سے کواڑ ہلے، دروازہ کھلا، یہ وہی تھی۔ ہومر کو یہ میکسیکن خاتون خوبصورت معلوم ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ عورت عمر بھر صابر رہی ہے اور اتنے برس کے بعد ایک پُر شفقت نورانی مسکراہٹ اس کے چہرے کا جزو بن چکی ہے۔ جن لوگوں کو تار نہ ملتے ہوں انہیں تار کے ہر کارے کی آمد پر سخت وحشت ہوتی ہے۔ ہومر نے پہچان لیا کہ اسے دیکھ کر عورت کے دل کو دھچکا سا لگا ہے۔

اس نے اس انداز سے ”اوہ“ کہا جیسے ہر کارے کی بجائے اس نے دروازہ کسی

ایسے دوست یا جانے پہچانے انسان کے لیے کھولا تھا جس کی آمد سے مسرّت ہوتی۔ وہ ہومر کی نگاہوں کو جانچنے لگی۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ لڑکا اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔

"تم تار لائے ہو؟"

اس میں ہومر کا کیا قصور تھا۔ اس کا کام ہی ایسا ہی تھا۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس گناہ میں وہ بھی برابر کا شریک ہے اور جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کہہ دے۔ "مسز اسیڈول، میں تو ایک غریب ہرکارہ ہوں اور اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ ایسا تار لایا ہوں۔"

"مسز روز اسیڈول کے نام۔" ہومر نے تار سامنے کر دیا لیکن عورت نے اسے چھُوا بھی نہیں۔

"آپ مسز اسیڈول ہیں؟"

"اندر چلے آؤ۔ میں میکسیکو کی ہوں۔ انگریزی نہیں جانتی، صرف وہ اخبار پڑھتی ہوں جو میکسیکو شہر سے آتا ہے۔"

ہومر دروازے میں اس طرح کھڑا تھا جیسے موقع پاتے ہی بھاگ نکلے گا۔

”تار کس چیز کے متعلق ہے ؟“

”مسز اسیڈول اس تار میں۔“

عورت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم نے لفافہ تو کھولا ہی نہیں، پہلے تار نکالو پھر پڑھ کر سناؤ۔“

”بہت اچھا۔“ ہومر نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ کسی اُستانی کے سامنے کھڑا ہو جس نے ابھی ابھی اس کی غلطی پکڑی ہو۔

کانپتی انگلیوں سے اس نے لفافہ کھولا۔ مسز اسیڈول نے فرش پر گرا ہوا خالی لفافہ اٹھالیا اور کاغذ کی سلوٹیں دور کرنے لگی۔

”تار کس نے بھیجا ہے ؟ میرے لڑکے جو آن ڈومنگو نے ؟“

”جی نہیں شعبۂ جنگ سے آیا ہے۔“

”شعبۂ جنگ سے ؟“

”مسز اسیڈول آپ کا لڑکا مر گیا۔ شاید یہ خبر غلط ہو۔ ایسی غلطیاں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ شاید یہ خبر آپ کے لڑکے کے متعلق نہ ہو۔ کوئی اور مارا گیا ہو۔ تار میں یہ

لکھا ہے جو آن ڈو منگو جنگ میں کام آ گیا۔ لیکن یہ تار غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

میکسیکن عورت نے جیسے سُنا ہی نہیں۔ "ڈرو مت۔ اندر آ جاؤ۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی اور کرسی پر بٹھا دیا۔

"تمہارے لیے مٹھائی لاؤں۔"

وہ ساتھ کے کمرے سے ایک پرانا ساڈبہ اٹھا لائی۔ اس میں سے ایک عجیب قسم کی مٹھائی نکال کر ہومر کو دی۔ "لو کھاؤ۔ بچّے تو مٹھائی پر جان دیتے ہیں۔"

ہومر ڈلی چبانے لگا۔

"تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ میرا جونٹیو اس عمر میں بالکل تم جیسا تھا۔ تم ہرگز کوئی بُری خبر نہیں لا سکتے۔ لو ایک ڈلی اور لو۔"

وہ مٹھائی کی خشک ڈلی چبا رہا تھا اور عورت کہہ رہی تھی۔ "یہ گھر کی بنی ہوئی مٹھائی ہے۔ اسے ناگ پھنی کے خار دار پودے سے بناتے ہیں۔ میرے جونٹیو کو یہ بہت پسند ہے۔ میں نے اسی کے لیے بنائی تھی۔ وہ یہاں ہوتا تو بڑے شوق سے کھاتا۔ لیکن تم بھی میرے بیٹے ہو۔ اب تم کھاؤ۔"

وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے بہت ضبط کیا ہوا تھا جیسے وہ رونے کو باعثِ

شرم سمجھتی ہو۔

ہومر چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے لیکن اس کے پاؤں شل ہو چکے تھے اگر یہ کوشش بھی کرتا تب بھی وہاں سے نہ ہل سکتا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس عورت کا غم کیونکر بٹائے۔ اگر اس نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تو بھی وہ انکار نہ کر سکے گا۔ ایسی مہربان اور غمزدہ عورت کا کہا کوئی کیسے ٹال سکتا ہے۔ دفعتاً وہ اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ اس شدید نقصان کی تلافی کر کے رہے گا مگر پھر سوچنے لگا کہ بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایک بیچارے ہر کارے کی بساط ہی کیا ہوتی ہے۔

عورت نے اسے بازوؤں میں لے لیا اور چلائی۔ ”میرے ننھے بچّے میرے لال۔“ ہومر کی طبیعت منغّض ہو گئی۔ اسے یہ سب کچھ بے حد کریہہ معلوم ہوا۔ یہ کراہت جیسے اس کے خون میں پھیل گئی۔

اسے اس عورت سے نفرت تھی نہ کسی اور سے۔ لیکن اسے زندگی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

”آؤ۔ یہاں بیٹھو۔“ عورت نے اسے دوسری کرسی پر بٹھا دیا۔ ”تمہیں دیکھوں تو!“

عورت اس عجیب طرح دیکھ رہی تھی۔ ہومر بالکل بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ ساتھ ہی اس بیچاری عورت پر ترس بھی آ رہا تھا۔ یہ جذبۂ رحم محض ایک غم کی ماری ہوئی عورت کے لیے ہی نہ تھا بلکہ ان سب جاندار چیزوں اور ان کے دکھ جھیلنے اور مرنے کے مضحکہ خیز انداز پر بھی اسے اتنا ہی ترس آ رہا تھا۔

اس کی نگاہوں میں اس عورت کا ماضی پھرنے لگا۔ ایک نوخیز حسینہ پنگھوڑے کے پاس بیٹھی اپنے بچّے کو دیکھ رہی تھی۔ قدرت کا یہ ننھا مُنّا کرشمہ بے بس تھا، خاموش تھا۔ لیکن زندگی اور زندگی کی امیدیں اور ولولے، سب اس سے وابستہ تھے۔ حسینہ پنگھوڑے کو ہلا کر لوریاں گا رہی تھی۔ اس نے عورت کی طرف دیکھا۔ اب یہ کتنی بدل چکی ہے۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ دوڑ کر سائیکل سنبھالی اور تاریک گلی میں غائب ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔

تار گھر پہنچا تو آنسو خشک ہو چکے تھے۔ لیکن دل میں طرح طرح کے جذبے اُبل رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ یہ محسوسات یوں ہی رہیں گے۔ مدافعت بے سود ہے۔ ورنہ پھر زندگی اور موت میں فرق ہی کیا ہوا۔

ایک گیت

تار گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ یکایک تار کی مشین کٹکٹانے لگی۔ ہومر نے گروگن کی طرف دیکھا، وہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔

"مسٹر گروگن۔ پیغام آرہا ہے۔" اس نے بوڑھے کو ذرا سا ہلایا۔

"مسٹر گروگن۔ اُٹھیے۔ کوئی بُلا رہا ہے۔"

دوڑ کر ہومر ایک برتن میں پانی لایا، چھینٹے دینے لگا کہ جھجک گیا۔ اس نے برتن میز پر رکھ دیا۔

"اُٹھیے، مسٹر گروگن۔ اُٹھیے۔" وہ چلایا۔ آخر اسے چھینٹے دینے ہی پڑے۔

بوڑھا ٹھنڈے پانی سے چونک کر اُٹھا اور جلدی سے تار کی مشین سنبھال لی۔

"اچھا۔ اب جلدی سے کافی کا پیالہ۔"

ہومر دوڑ کر کاربٹ کی دکان سے کافی لایا۔ اتنے میں بوڑھے کی آنکھیں بھر بند

ہو چلی تھیں۔

"شاباش! بالکل ٹھیک! فکر کی کوئی بات نہیں۔ شاباش۔"

بوڑھے نے گرم گرم کافی کی چسکی لی۔

"پہلے سرد پانی کے چھینٹے۔ پھر سیاہ کافی۔"

"جی ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ تار ضروری ہے کیا؟"

"نہیں بالکل غیر ضروری ہے۔ کاروباری تار ہے۔ کچھ لوگ دولت ہی جمع کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھاؤ وغیرہ بھیجے ہیں۔ یہ تار رات کو پہنچانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صبح دے آنا۔ لیکن اسے وصول کرنا بہت اہم تھا۔" اب بوڑھا چوکنا ہو چکا تھا۔

"وہ مجھے ملازمت سے برطرف کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر جگہ مشینیں لگا دی جائیں۔" بوڑھا حقارت سے ہنسا۔ "طرح طرح کی نو ایجاد مشینیں انسانوں کی جگہ کام کریں گی۔ آج وہ مجھے نوکری سے ہٹا دیں تو پتہ نہیں میرا کیا حشر ہو۔ ہفتے دس دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکوں۔ میں نے زندگی بھر کام کیا ہے۔ اب میں کام نہیں چھوڑ سکتا۔"

”جی۔“

”تم قابلِ اعتماد ہو۔ تم میری مدد کرو گے۔ کیونکہ تم نے ابھی ابھی میری مدد کی ہے۔ جیتے رہو برخوردار۔“

تار کی مشین کھٹرک رہی تھی۔ بوڑھا پیغام ٹائپ کر رہا تھا۔

”وہ مجھے نکالنا چاہتے ہیں۔ شاید انہیں پتا نہیں کہ کسی زمانے میں، میں دنیا کا بہترین تار بابو تھا۔ ولنسکی سے بہتر۔ تار بھیجنے اور وصول کرنے میں میرا کوئی مقابل نہ تھا۔ مجھ سے ایک غلطی بھی نہیں ہوئی۔ دنیا بھر کے تار گھر میرے نام سے آشنا تھے۔ سب مانتے تھے کہ ولی گروگن سے کوئی ٹکر نہیں لے سکتا۔“

بوڑھے نے ہومر کی طرف دیکھا۔ ”ہو جائے ایک گیت، کیونکہ ہم تم ابھی زندہ ہیں۔“

ہومر گانے لگا۔

اگر پیام آئے

مسز میکالے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ ہومر گھر پہنچا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل تھیں۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی ماں بھانپ گئی کہ آج وہ متوحش اور بے چین ہے۔ وہ کچھ دیر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ پھر اندر جا کر دن بھر کی اہم خبریں بتانے کی بجائے کہنے لگا۔ ''امّی سب ٹھیک ہے۔ بس آپ اتنی دیر تک میرا انتظار نہ کیا کریں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ اور یہاں بیٹھ جاؤ۔''

وہ پرانی کُرسی پر دھم سے گر پڑا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ تم پریشان سے ہو۔''

''سوچ رہا ہوں کہ کسی طرح آپ کو بتاؤں۔ آج ایک میکسیکی خاتون کے ہاں مجھے تار لے جانا پڑا۔ تار شعبۂ جنگ سے آیا تھا۔ ان کا لڑکا لڑائی میں مارا گیا۔ لیکن انہیں یقین ہی نہ آتا تھا۔ آج تک میں نے کسی کو اس قدر دل شکستہ نہیں دیکھا۔

انہوں نے مجھے مٹھائی کھلائی، بہت سا پیار کیا اور کہا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہی تھیں کہ مجھے خود یہ محسوس ہوا جیسے میں ان کا بیٹا ہوں۔ میرا جی بہت خراب ہوا۔ دفتر پہنچا تو تار بابو نشے میں دھت تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق پہلے اس کے منہ پر پانی چھڑکا، پھر سیاہ کافی پلائی۔ اگر اس نے ٹھیک طرح کام نہ کیا تو اسے پنشن دے دی جائے گی۔ پنشن کے نام سے اسے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ خیر آج تو وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ اپنے متعلق باتیں سُناتا رہا۔ پھر ہم دونوں نے مل کر گانا گایا۔ لیکن میں اداس سا ہو گیا۔"

وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر دروازے میں جا کھڑا ہوا اور باہر دیکھنے لگا۔ نہ جانے میں آج کیوں اپنے آپ کو اس قدر تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ جب والد کا انتقال ہوا تھا، تب بھی ایسے خیالات نہیں آتے تھے کیونکہ ان کی جدائی پر آپ ہمارا آسرا بن گئی تھیں۔ آپ نے کبھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ کوئی تغیر آیا ہے۔ سب کچھ پہلے کی طرح رہا۔ لیکن آج معلوم نہیں کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بہت کچھ بدل چکا ہے۔

وہ مُڑا اور اپنی والدہ سے مخاطب ہوا۔ "امّی فقط دو ہی دن میں اتنا تغیر کیسے آ گیا۔ میں اداس ہوں، دل برداشتہ ہوں۔ لیکن وجہ نہیں جانتا۔"

ان کی ماں خاموش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ لڑکا باتیں کرتا رہے۔

”میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور کس لیے ہو رہا ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کبھی کوئی صدمہ نہ پہنچے، ہر شعبے میں تغیر آجائے لیکن آپ اس گھر میں کوئی تغیر نہ آنے دیں۔“

اس کی ماں مسکرانے لگی۔ جب لڑکا خاموش ہوا تو بولی۔ ”بیٹے یہ تغیر جو تمہیں محسوس ہو رہا ہے۔ ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ احساسِ تنہائی اس لیے ہے کہ تم اب بچّے نہیں رہے۔ لیکن تنہائی کہاں نہیں؟ یوں تو ازل سے دنیا میں ہے۔ لڑائی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ جنگ کی تخلیق نہیں بلکہ یہ خود انسان کو جنگ لڑنے پر اکساتی ہے۔ جب ہر چیز سے برکت اُٹھ جاتی ہے اور انسان کا عقیدہ ڈگمگانے لگتا ہے۔ لیکن ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ ہم نہیں بدلیں گے۔“

وہ سوچ رہی تھی کہ اگر کسی روز کوئی ایسی خبر آگئی تو پھر کیا ہو گا۔ اگر کسی دن مجھے یہ پیغام ملا جو آج میکسیکی خاتون کو ملا تھا تو میں اس کا ایک ایک حرف سچ مان لوں گی۔ میں روؤں گی بھی نہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے کو کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے آج کیا کھایا تھا؟“

”سموسے کھائے تھے۔ سیب، ناریل اور بالائی کے مزے دار سموسے۔ میجر

صاحب نے لے کر دیئے تھے۔ امی وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

"کل بیس کے ہاتھ دوپہر کا کھانا بھجواؤں گی۔"

"نہیں امّی مجھے دوپہر کا کھانا نہیں چاہیے۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ ہم اکٹھے مِل کر کہیں نکل جاتے ہیں اور کھانا کھا لیتے ہیں۔ خوب لطف آتا ہے۔ یہ ملازمت بہت اچھی ہے۔ اب مجھے سکول اتنا اچھا نہیں لگتا۔"

"بیٹا سکول اس لیے ہیں کہ بچّوں کو گلیوں کی آوارگی سے بچائیں۔ لیکن ایک نہ ایک دن طوعاً کرہاً سب کو گلیوں میں نکلنا ہی پڑتا ہے۔ والدین بچّوں کو اتنی بڑی دنیا میں بھیجنے سے ڈرتے ہیں۔ ان کا یہ ڈر فطری ہے لیکن بچّوں کو کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ دنیا ڈرے ہوئے بچّوں سے پہلے ہی بھری پڑی ہے۔ خود خوفزدہ ہیں اس لیے دوسروں کو بھی خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ بیٹے تم کسی سے مت ڈرنا۔ جو ملے اس سے محبت سے پیش آنا۔ میں ہر رات اس کمرے میں تمہارا انتظار کروں گی۔ لیکن جب تمہارا جی باتیں کرنے کو نہ چاہے تو سیدھے جا کر سو جایا کرو، میں برا نہیں مانوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ بعض اوقات زبان ان جذبات کا اظہار نہیں کرتی جو دل میں ہوتے ہیں۔ تم تھکے ہوئے ہو، سو جاؤ۔"

"بہت اچھا امّی۔" ہومر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اے خدا ہمارے قریب رہ!

صبح سات بجے الارم بجا۔ ہومر نے جلدی سے اسے بند کر کے کتاب نکالی جس میں ورزش کی ہدایتیں تھیں۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی گھنٹی کے شور سے جاگ اٹھا تھا۔

ہومر ساتویں ورزش کرنے لگا۔ یولی سیز اس کے پاس کھڑا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہومر نے اچھل کود کی۔ لمبے لمبے سانس لے کر فرش پر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ پاؤں اوپر اٹھانے لگا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”ورزش۔“

”ورزش کس لیے کرتے ہیں؟“

”پٹھوں کو مضبوط بنانے کے لیے۔“

”آپ دنیا میں سب سے طاقتور انسان بننا چاہتے ہیں؟“

”نہیں تو۔“

”تو پھر کیا بننا چاہتے ہیں؟“

”تم چپ چاپ سو رہو۔“

یولی سیز فرمانبردار بچّے کی طرح لیٹ گیا مگر ذرا سی دیر میں پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

ہومر کپڑے بدل رہا تھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”سکول۔“

”پڑھنے جا رہے ہیں؟“

”آج دو سو بیس گز کی دوڑ میں حصّہ لوں گا۔“

”یہ دوڑ کس طرح دوڑتے ہیں؟“

”دس دس گز کے فاصلے پر لکڑی کے چوکھٹے ہوتے ہیں۔ بھاگتے میں ان پر سے

بھی کودنا پڑتا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ یہ ضروری ہے۔ سب کو کرنا پڑتا ہے۔ جو اس قصبے میں پیدا ہوتا ہے اسے دوڑ میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اتھیکا کی یہ دوڑ بڑی مشہور ہے۔ ہمارے دفتر کے مینجر صاحب نے سکول میں یہ دوڑ جیتی تھی۔ یہ اس علاقے کے چمپئین تھے۔“

”علاقے کا چمپئین کیا ہوتا ہے؟“

”جو سب کو ہرا دے وہ چمپئین کہلاتا ہے۔“

”آپ بھی سب کو ہرا دیں گے؟“

”معلوم نہیں، میں کوشش کروں گا۔ تم سو کیوں نہیں جاتے؟“

یولی سیز بستر میں دُبک گیا اور آہستہ سے بولا: ”کل میں نے مال گاڑی دیکھی تھی۔“

ہومر کو معلوم تھا کہ چھوٹا بھائی کیا بتانا چاہتا ہے۔ خود اس نے بھی جب ٹرین

دیکھی تھی تو بڑی کشش محسوس کی تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ ”کیسی تھی مال گاڑی؟“

”اس میں ایک حبشی تھا جس نے میرے سلام کا جواب دیا۔“

”پہل کس نے کی تھی؟“

”پہلے میں نے سلام کیا اس نے جواب دیا۔ پھر میں نے ہاتھ ہلائے تو اس نے بھی ہاتھ ہلائے۔ یہ کینٹکی کا گیت گا رہا تھا۔“

”اچھا؟“

”اس نے یہ بھی کہا تھا۔ میں وطن جا رہا ہوں۔ بھائی جان ہم وطن کب جائیں گے؟“

”ہم تو وطن میں ہیں۔“

”تو وہ یہاں آ جاتا۔“

”ہر ایک کا اپنا اپنا الگ وطن ہوتا ہے۔ کسی کا وطن مشرق میں ہے کسی کا مغرب میں، کسی کا شمال میں، کسی کا جنوب میں۔ ہمارا مغرب میں ہے؟“

”کیا مغرب سب سے اچھا ہے؟“

”معلوم نہیں۔ میں اور کہیں تو گیا نہیں۔“

”جائیں گے؟“

”ضرور جاؤں گا۔“

”کہاں؟“

”نیویارک۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”مشرق میں ہے۔ نیویارک سے لندن، وہاں سے پیرس۔ پھر برلن، سٹاک ہوم، کبھی یہ سب بڑے شہر دیکھوں گا۔“

”آپ واپس تو آجائیں گے نا؟“

”ہاں۔“

”واپس آکر آپ کو خوشی ہو گی؟“

"ہاں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ یہاں امّی ہوں گی۔ مارکس اور میں ہوں گے۔ تم ہو گے اور میری ایرینا اور اس کے ابّا ہوں گے۔ وطن واپس آنے سے بڑی خوشی ہو گی۔ ہم پیانو بجائیں گے گائیں گے، اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔"

"آپ پردیس نہ جایئے۔" چھوٹے بھائی نے التجا کی۔ "للّٰہ نہ جایئے۔"

"میں ابھی فوراً ہی تو نہیں جا رہا ہوں۔"

"کبھی بھی نہ جایئے۔ ابّا گئے تو وہ واپس نہیں آئے۔ مارکس اب تک پردیس میں ہے۔ آپ بھی جانا چاہتے ہیں۔"

"لیکن میرے باہر جانے میں ابھی دیر ہے۔ اب تم سو جاؤ۔"

"بہت اچھا۔ آپ بائیس گز کی دوڑ میں حصّہ لیں گے؟"

"بائیس نہیں۔ دو سو بیس۔"

ہومر کی ماں اور بہن ناشتے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ تینوں نے پہلے دُعا مانگی

پھر کھانا شروع کیا۔

"تم نے کون سی دُعا مانگی؟" بیس نے بھائی سے پوچھا۔

"وہی جو روز مانگتا ہوں۔" ہومر نے دعا کے الفاظ دُہرائے۔

"اے خدا ہمارے قریب وہ

پیارے خدا ہر وقت ہمارے ساتھ رہ

ہم پر اپنی برکتیں اُتار

بہشت میں ہمیں اپنی ضیافت پر بُلا

آمین!"

"یہ تو بہت پرانی دُعا ہے اور تم اسے یوں ادا کرتے ہوئے جیسے رٹّی ہوئی عبارت دوہرا رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں جلدی میں ہوتا ہوں اور بھوکا ہوتا ہوں۔ ویسے مجھے اس کا مطلب معلوم ہے۔ الفاظ میں کیا رکھا ہے۔ اصل مقصد تو خدا کو یاد کرنا ہے۔ آپ نے کونسی دُعا پڑھی؟"

"پہلے اپنی دُعا کے معنی بتاؤ۔"

"دُعا کے معنی وہی ہیں جو ہونے چاہئیں۔"

"تو پھر بتاؤ۔ کیا معنی ہیں؟"

"اے خدا ہمارے قریب رہ۔ اس کا مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے نزدیک رہ۔ ہر وقت ہمارے ساتھ۔ یعنی ہمیں اچھی شے سے محبت کرنے کی صلاحیت عطا فرما۔ ہم پر اپنی برکتیں اُتار۔ تاکہ ہم معاف کرنا سیکھیں۔ اس کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یعنی بہشت میں جو ضیافتیں ہوں گی ان پر ہمیں نہ بھولیے گا۔"

"لفظ 'خدا' سے کس طرف اشارہ ہے؟"

ہومر اپنی والدہ سے کہنے لگا۔ "کیوں امّی دُعا کا یہی مطلب ہے؟ اچھے لوگ جب کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو گویا بہشتی ضیافت میں شریک ہوتے ہیں۔ لفظ خدا کے کئی معنے ہوسکتے ہیں۔"

"تو 'خدا' کوئی نہ کوئی تو ہوا نا؟" بیس نے پوچھا۔

"ہاں جیسے میں کوئی نہ کوئی ہوں۔ امّی اور آپ اور دوسرے لوگ بھی کوئی نہ کوئی ہیں۔ دُعا کے ذریعے یہ خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ ہمارے لیے دنیا بہشت بن

جائے اور جو ہمارے ساتھ کھانا کھائے وہ ضرور کوئی نہ کوئی ہو۔ آپا یہ ایک معمولی سی دُعا ہے۔ آپ تو یونہی لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی ہیں۔ آپ کتنا ہی پریشان کیوں نہ کریں۔ میرے عقیدے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس دُعا پر میرا عقیدہ ہے بلکہ ہم سب کا عقیدہ ہے۔ کیوں امّی؟"

"سچ کہتے ہو۔" مسز میکالے بولی۔ "یہ عقیدہ ہی ہے جس سے لوگ زندہ ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا بھر کی نعمتیں سامنے رکھی ہیں، ضیافت کا سماں نہیں بندھتا۔ عقیدہ ہی ہر نشے میں رنگ بھرتا ہے۔"

"سُن لیا آپا!" ہومر نے دفعتاً بحث ختم کر دی۔ "آج میں دو سو بیس گز کی دوڑ میں حصّہ لوں گا۔ یہ یہاں کی بڑی مشہور دوڑ سمجھی جاتی ہے۔ دوڑنے کے علاوہ اس میں کودنا بھی پڑتا ہے۔ جب مسٹر سپنگلز سکول میں تھے ان دنوں وہ بھی دوڑے تھے۔ ان کی جیب میں ہر وقت ایک اُبلا ہوا انڈہ ہوتا ہے۔ وہ اسے خوش نصیبی کی علامت سمجھتے ہیں۔"

"جیب میں اُبلا ہوا انڈا! کچھ وہمی سے معلوم ہوتے ہیں۔" بیس بولی۔

"وہمی ہوں یا کچھ اور، مجھ پر بڑے مہربان ہیں۔ انہوں نے مجھے دو سموسے لے کر دیئے۔ مسٹر گروگن تو چوتھائی حصّہ بھی نہ کھا سکے۔ انہیں کھانے سے زیادہ

پینے سے رغبت ہے۔"

اتنے میں پڑوس کی میری ایرینا آگئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پیالہ تھا۔

"آیئے۔ ناشتہ کیجئے۔" ہومر بولا۔

"شکریہ۔ میں نے ابھی ابھی ابّا کے ساتھ ناشتہ کیا ہے۔ انہیں کام پر روانہ کر کے آرہی ہوں۔ اس پیالے میں تھوڑا سا آڑوؤں کا مربّہ ہے۔"

"شکریہ" مسز میکالے نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "تمہارے ابّا کیسے ہیں؟"

"جی اچھے ہیں۔ بس ہر وقت چھیڑتے رہتے ہیں۔ صبح اٹھتے ہی پہلا سوال ہوتا ہے کہ مارکس کا کوئی خط آیا؟"

"چلو۔" میری بولی۔ پھر مسز میکالے سے کہنے لگی۔ "میں کالج سے سچ مچ تنگ آ چکی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہائی سکول میں دوبارہ پڑھ رہی ہوں۔ پڑھنے کی میری عمر نہیں رہی۔ جی چاہتا ہے کہیں ملازمت کر لوں۔"

"جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔" بیس بولی۔

"تم تو نری بچیاں ہو۔ بھلا سترہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ ایک کے ابّا

اچھی جگہ ملازم ہیں دوسری کے بھائی کی نوکری بھی بری نہیں۔ تم دونوں کو فکر نہیں کرنا چاہیے۔“

”مگر یہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ مارکس تو فوج میں ہو۔ دنیا میں سب ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہوں اور میں مدرسے میں پڑھتی ہوں۔ اگر میں لڑکا ہوتی تو سپاہی بنتی۔ پھر میں اور مارکس فوج میں اکٹھے ہوتے۔“

”فکر مت کیا کرو میری۔“ مسز میکالے بولیں۔ ”یہ بُرے دن گزر جائیں گے۔ وہی زمانہ آجائے گا جو پہلے تھا۔“

میری اور بیس دونوں چلی گئیں۔ ہومر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”امّی! اس کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”اس میں ہرج ہی کیا ہے، لڑکیوں کا جی چاہ رہا تھا باہر چلی گئیں۔“

”جی نہیں، میں تو میری کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”میری بڑی پیاری لڑکی ہے۔ بھولی بھالی نیک اور کہنا ماننے والی۔ میں بہت خوش ہوں کہ مارکس اسے چاہتا ہے۔ اسے اس سے بہتر کوئی اور لڑکی نہیں مل سکتی۔“

”وہ تو میں سب جانتا ہوں۔ میں کچھ اور کہہ رہا تھا۔ امّی آپ سمجھی نہیں۔“

وہ خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب امّی کو کیا بتاؤں گا کہ اس جنگ میں بہت سے لوگوں کے دل دُکھیں گے۔ ان لوگوں کو صدمہ پہنچے گا جو جنگ سے سدا دُور رہیں گے۔

"میں رات کو لوٹوں گا۔" ہومر سلام کر کے چلا گیا۔ مسز میکالے سوچتی رہی کہ لڑکا کیا کہنا چاہتا تھا۔ اچانک یولی سیز سامنے آ گیا جو شب خوابی کے لباس میں بہت چھوٹا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی والدہ کو بڑی پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے ایک جاندار اپنی نوع کے دوسرے جاندار کو دیکھ کر مسرّت اور تسکین کا اظہار کرتا ہے۔

"امّی! وہ یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ میرے محبوب مت رو آج مت رو۔"

"کون؟"

"وہ حبشی جو مال گاڑی میں جا رہا تھا۔"

"وہ تو گیت گا رہا تھا اب تم کپڑے بدلو۔"

"وہی حبشی آج بھی ٹرین میں ہو گا؟"

"ہاں!"

خرگوش یہیں کہیں ہوں گے

سکول جاتے وقت ہومر ایک عجیب سے احاطے کے قریب سے گزرا۔ اندر فضول سی جھاڑیاں اور بیلیں تھیں اور چاروں طرف بوسیدہ جنگلا۔

اندر کا جھاڑ جھنکاڑ تو بے مصرف تھا ہی، یہ جنگلا بھی بالکل بیکار تھا۔ ایسے قطعے کی حفاظت کرنا اچھا خاصا مسخرا پن تھا۔

ہومر نے پھُرتی سے سائیکل روکی۔ اسے ایک طرف پھینک کر جنگل کی طرف اس طرح بھاگا جیسے وہاں کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ لکڑی کے ان چو کھٹوں سے جنہیں اسے دوڑ میں پھلانگنا تھا۔ یہ جنگلا ایک گز اونچا تھا اور اُسکی کمر سے ذرا اوپر آتا تھا۔ اس نے بڑے غور سے جگہ کا مطالعہ کیا۔ دوسری طرف جھاڑیاں دیکھیں۔ قدم گِن کر دس گز کے فاصلے پر نشان لگایا اور جنگل کی طرف دوڑا۔ قریب پہنچ کر اس نے زور سے چھلانگ لگائی۔ جنگلے سے ٹھوکر کھا کر دھڑام سے دوسری طرف گرا۔ ٹہنیوں اور بیلوں کو ہٹا کر اٹھا اور دوسری مرتبہ کوشش کی۔ پھر گرا اور

ٹھوکر سے جنگلے کی لکڑی توڑ ڈالی۔

اس نے سات مرتبہ کوشش کی اور ہر دفعہ ناکام رہا۔ جنگلے کے پرخچے اُڑ چکے تھے۔ سامنے کے شکستہ مکان کا دروازہ کھلا ایک بوڑھا مُنہ میں پائپ دبائے باہر نکلا اور اس کود پھاند کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

اس مرتبہ جو ہومر جھاڑیوں سے برآمد ہوا تو بوڑھے نے پوچھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"چھلانگ لگانے کی مشق کر رہا ہوں۔"

"چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں۔ بس یہ جنگلا ذرا اونچا ہے۔ ادھر گھاس پھونس پر پاؤں بھی پھسل جاتا ہے۔"

"ان جھاڑیوں کو خرگوش بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ گیارہ برس ہوئے میں نے یہاں بہت سے خرگوش پال رکھے تھے۔ کسی نے رات کو دروازہ کھول دیا اور سب بھاگ گئے۔"

"دروازہ کس نے کھولا؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ کون تھا، تینتیس خرگوش تھے۔ ایک سے ایک خوبصورت گلابی آنکھیں پیاری پیاری شکلیں۔ کسی نے ناحق بھگا دیئے۔"

"آپ کو خرگوش پسند ہیں؟"

"بہت پسند ہیں۔ بڑے حلیم الطبع ہوتے ہیں۔ پالتو خرگوش تو نہایت ہی غریب مزاج ہوتے ہیں۔ گیارہ برس سے تینتیس خرگوش بالکل آزاد ہیں۔ اب تک تو نہ جانے تعداد کہاں پہنچی ہو گی۔ جس تیزی سے ان کی نسل بڑھتی ہے اس سے تو مجھے یہی شبہ رہتا ہے کہ سارا قصبہ خرگوشوں سے بھرا ہوا ہو گا۔"

"شاید تمہیں نظر نہ آئے ہوں لیکن وہ سب یہیں کہیں ہیں۔ چند سال اور گزر گئے تو اتنے سارے خرگوش یہاں کے باشندوں کا جینا محال کر دیں گے۔"

ہومر نے سائیکل سنبھالی۔ "اچھا میں چلوں۔ آپ سے پھر کبھی ملاقات ہو گی۔"

"ضرور ہو گی۔ میرا نام چارلس ہے۔ لیکن تم مجھے چارلی کہہ لیا کرو۔"

"بہت اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ سہ پہر کو مجھے ہائی سکول کی دو سو بیس گز کی دوڑ

میں حصّہ لینا ہے۔“

”میں نے کبھی سکول کی شکل تک نہیں دیکھی البتہ ہسپانیہ اور امریکہ کی جنگ میں لڑا تھا۔“

”اچھا؟“

”ہاں! ہسپانیہ اور امریکہ کی جنگ میں، اور زیادہ وقت خرگوشوں کی طرح بھاگنے میں گزرا۔“

ہومر سائیکل پر روانہ ہوگیا۔ بوڑھا اپنے مکان کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک جھاڑی میں چھڑی گھونپ کر بولا۔ ”خرگوش یہیں ہونے چاہئیں۔ ضرور یہیں کہیں ہوں گے۔“

تاریخِ قدیم

ہائی سکول کے میدان میں دو سو بیس گز کی دوڑ کی سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ چار لڑکے دوڑنے کی مشق کر رہے تھے۔ چاروں خوب چُست اور پھُرتیلے تھے۔ لکڑی کے چوکھٹوں کو بڑی صفائی سے پھلانگتے جا رہے تھے۔ دوڑ ختم ہوئی تو ڈرل ماسٹر بائی فیلڈ گھڑی تھامے ہوئے آیا۔ اور اوّل آنے والے لڑکے سے بولا۔ ''شاباش ایکلے۔''

جسے شاباش ملی وہ دوسرے لڑکوں سے کچھ مختلف ضرور تھا لیکن ایسا نہیں کہ نرالا سمجھا جائے۔ چال ڈھال سے یہ کسی ایسے خوش نصیب کُنبے کا معلوم ہوتا تھا جو فکرِ معاش سے سدا آزاد رہا ہو بلکہ جس نے دوسروں کو بھی آڑے وقت میں مدد دی ہو۔

''ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ لیکن شام کی دوڑ ضرور جیت جاؤ گے۔''

''جی میں پوری کوشش کروں گا۔'' لڑکے نے کہا۔

"اس دوڑ میں تو تم یقیناً نکل جاؤ گے لیکن جب قصبے بھر کے لڑکے شریک ہوں گے تو مقابلہ سخت ہو گا۔ ان دو ہفتوں میں تمہیں کافی مشق کرنی ہو گی۔ جاؤ نہالو اور سہ پہر تک آرام کرو۔"

"جی میں نے زیادہ وقت تو نہیں لیا؟"

"نہیں کچھ اتنا زیادہ تو نہیں تھا لیکن کم بھی ہو سکتا ہے۔ فکر مت کرو۔ جو میں نے سکھایا ہے اس پر عمل کرو ضرور جیت جاؤ گے۔"

باقی تین لڑکے ایک طرف کھڑے یہ باتیں سُن رہے تھے۔

"نخرے تو لڑکیوں کی طرح کرتا ہے لیکن کم بخت ہر دفعہ جیت جاتا ہے۔ سام تم کچھ نہیں کرتے۔"

"میں کیا کروں؟ تم خود کیوں نہیں کرتے؟ ہراؤ اسے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"میں دوسرے نمبر پر تو آ ہی جاتا ہوں۔"

"دوم آنا ایسا ہی جیسے سوم آنا۔"

”حد ہو گئی۔ ہیر وبرٹ ایکلے جیسا لڑکا ہمیں ہر بار ہرا دے۔ شرم آنی چاہیے یارو۔“

”اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ وہ ہم سب سے بہتر دوڑتا ہے بس۔“

بائی فیلڈ اب ان کی طرف متوجہ ہوا اور بڑی بے اعتنائی سے بولا۔

”نکمّوں کی طرح باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ چلو ایک دفعہ اور دوڑو۔“

لڑکے دوڑنے لگے۔ بائی فیلڈ نے انہیں دوڑا دوڑا کر بالکل تھکا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پہلے ہی سے ہیو برٹ ایکلے کو جتانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تاریخ قدیم کا لیکچر شروع ہونے والا تھا۔ اُستانی مس ہکس منتظر تھی کہ سب بیٹھ جائیں تو سبق شروع کرے۔ اس کی عادت تھی کہ جب تک بچّے بالکل خاموش نہ ہو جاتے وہ انتظار کرتی رہتی۔ آخر بچّوں کو کتابی سبق کے علاوہ عملی سبق کی بھی تو ضرورت تھی۔ بچّے آج سکول میں ہیں تو کل ذمہ دار شہری ہوں گے۔

ایک لڑکی ہیلن ایلیٹ داخل ہوئی۔ ہومر بے وقوفوں کی طرح اسے تکنے لگا۔ اس کے خیال میں یہ دنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ وہ مغرور تھی۔ لیکن ہومر غرور کو ایک عارضی کیفیت سمجھتا، حالانکہ یہی غرور ہومر کی محبت میں حائل تھا۔

اس کے بعد ہیوبرٹ اکیلے داخل ہوا۔ وہ سیدھا ہیلن کے پاس گیا اور کھُسر پھُسر کرنے لگا۔ ہومر کے جیسے آگ لگ گئی۔

سب طلبہ آ چکے تھے۔ مس ہکس نے کہا۔ ”بس اب خاموش ہو جاؤ۔ کون کون غیر حاضر ہے؟“

”ایک تو بندہ غیر حاضر ہے۔“ جوزف بولا جو جماعت کا مسخرہ تھا۔ اس کے چار پانچ ساتھی، جو اس قسم کے بے ڈھنگے مزاح کے دلدادہ تھے زور زور سے ہنسنے لگے۔ ہیلن اور ہیوبرٹ نے بڑی حقارت سے پیچھے مُڑ کر دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں یہ کون بد تمیز دیہاتی ہیں؟

اس سے ہومر اتنا چڑا کہ جب سب ہنس چکے تو اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور اپنے رقیب ہیوبرٹ اور محبوبہ ہیلن کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔“

یہ تماشا کر کے وہ جوزف کو ڈانٹنے لگا۔ ”جوزف! جب مس ہکس بول رہی ہوں تو چپ رہا کرو۔“

”جوزف اور ہومر! تم دونوں چپ رہو۔“ مس ہکس بولی۔

"بچّو! کل ہم نے اشوریوں کے متعلق پڑھا تھا۔ اب نیا سبق توجّہ سے سُنو۔ پہلے کتاب پڑھیں گے، پھر زبانی بحث ہو گی۔"

مسخرا پھر بول پڑا۔ "زبانی بحث بیکار ہے۔ کیوں نہ خاموشی سے بحث کی جائے تا کہ میں کچھ اور سو لوں۔"

اس کے چیلے پھر ہنسے۔ ہیلن اور ہیوبرٹ نے پھر غصّے سے مُڑ کر دیکھا۔ اُستانی خاموش ہو گئی۔ جہاں اس مسخرے کی باتوں پر ہنسی آتی تھی وہاں اسے سیدھا کرنا بھی ضروری تھا۔ کم بخت حاضر جواب ایسا تھا کہ اُستانی کو ڈانٹنے میں بھی دیر لگتی۔ "اچھا جوزف! اب اُلٹی سیدھی مت ہانکو۔ چلو تم درست کہتے ہو۔ میں غلطی پر ہوں۔" مس ہکس نے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ یوں ہی مجھے خیال آ گیا کہ بحث ہمیشہ زبانی ہی تو ہوتی ہے۔ بحث کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ بہر حال میں معافی چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مربّیانہ انداز میں ہاتھ ہلایا۔ "مس ہکس اپنا سبق جاری رکھئے۔"

اُستانی نے عینک درست کی اور بولی۔ "اچھا اب سب توجّہ سے سنو۔"

"توجّہ؟ یہ تو سب کے سب اونگھ رہے ہیں۔" جوزف پھر بول اٹھا۔

اب اُستانی سے نہ رہا گیا۔ ”اگر تم خاموش نہ ہوئے تو تمہیں پرنسپل کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔“

”جی میں تو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ انہیں دیکھیئے یہ تو سب کے سب اونگھ رہے ہیں۔“

”زیادہ مت بکا کرو جوزف۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم خرافات کے ماہر ہو۔“ ہومر چلایا۔

”تم دونوں چپ رہو۔ صفحہ نمبر ایک سو سترہ دوسرا پیرا۔“

سب نے وہ صفحہ نکال لیا۔

”بعض اوقات تاریخِ قدیم کا مطالعہ خشک اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب ہر روز تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔ شاید بچّوں کو گزرے ہوئے اجنبی سے زمانے کا ذکر فضول سا معلوم ہوتا ہو گا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ہمیں ماضی سے شناسا ہونا چاہیے۔ دنیا میں کیسے کیسے لوگ آئے اور چلے گئے۔ کتنی تہذیبیں پھیلیں اور مٹ گئیں۔ کتنی قومیں بسیں اور تباہ ہو گئیں۔ سبق کون پڑھے گا؟“

دو لڑکیوں اور ہیوبرٹ نے ہاتھ اٹھائے۔ اُستانی نے لڑکیوں میں سے ہیلن کو چنا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور بڑے وقار سے چلتی ہوئی سب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ہومر پھر اسے بیوقوفوں کی طرح تکنے لگا۔ وہ سبق پڑھ رہی تھی تو یہ سوچ رہا تھا کہ صرف چہرہ ہی حسین نہیں آواز بھی سریلی ہے۔ خوب لڑکی ہے یہ۔

"اشوریوں کی ناک لمبی تھی، سر کے بال لمبے تھے اور داڑھیاں بھی لمبی لمبی تھیں۔ انہوں نے شمال میں نینوا کا عظیم شہر بسایا۔ حطیطیوں، مصریوں اور دوسروں سے جنگیں لڑیں۔ گیارہویں صدی قبل از مسیح میں تغلت پلیسر اوّل کے عہد میں انہوں نے بابل فتح کیا۔ کئی سو سال تک پتھر کے بنے ہوئے نینوا اور اینٹوں سے تعمیر شدہ بابل نے ان کے اقدار کے مدّ و جزر دیکھے، شامی اور اشوری دو مختلف قومیں تھیں۔ ان میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ تغلت پلیسر سوم نے شامیوں کو شکست دے کر بنی اسرائیل کے دس گمشدہ قبیلوں کو جلا وطن کر دیا۔"

ہیلن سانس لینے کو رکی تو ہومر جلدی سے بولا۔ "ہیوبرٹ ایکلے سوم کے متعلق بھی تو بتایئے۔ اس نے کیا فتح کیا تھا؟"

ایکلے خفا ہو کر اٹھا۔ "مس ہکس۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے

شرارت کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ یا تو آپ ہومر کو پرنسپل کے سامنے پیش کر دیں ورنہ، ورنہ پھر مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔"

ہومر جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا بکتے ہو! تین نسلوں سے یہ نام تمہارے خاندان میں چلا آتا ہے۔ پس تم ہیوبرٹ ایکلے سوم ہو۔ بھلا تم نے کون سا کارنامہ دکھایا ہے۔ سوچا جائے تو ہیوبرٹ ایکلے دوم یا اوّل نے کون سے تیر مارے تھے۔ جواب دو کیا کیا تھا ان حضرات نے؟"

"کم از کم ایکلے خاندان میں آج تک کوئی گنوار پیدا نہیں ہوا۔ گنوار اور ہونّق الحس۔"

ہومر نے اُستانی سے پوچھا۔ "بھلا اس ترکیب کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

ابھی اُستانی مناسب الفاظ سوچ رہی تھی کہ ہومر بولا۔ "سنیئے نمبر تین صاحب! اگر آپ گالیاں ہی دینا چاہتے ہیں تو کم از کم عام فہم گالیاں دیجیئے۔"

"ہونّق الحس، بیہودہ شخص کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ انسان جو بالکل۔" ہیوبرٹ نے وضاحت کرنا چاہی۔

"خبردار جو کچھ اور کہا تو۔" ہومر نے اسے خاموش کرا دیا۔

ہیلن اُستانی کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اجازت ملے تو سبق پڑھنا شروع کرے لیکن اُستانی چُپ تھی۔

آخر ہومر کچھ سوچ کر اٹھا اور ہیوبرٹ کے پاس جا کر بولا۔

"مجھے معاف کر دو۔"

"بہت اچھا۔" ہیوبرٹ بولا۔

"ہومر اور ہیوبرٹ سبق کے بعد اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔" اُستانی نے کہا۔

"لیکن مس ہکس۔ ہمیں دوڑ میں حصّہ لینا ہے۔" ہومر نے احتجاج کیا۔

"تمہیں کہیں نہیں جانا ہے۔ صحیح تربیت اتنی ہی ضروری ہے جتنی جسمانی نشوونما بلکہ کچھ زیادہ ہی اہم ہے۔"

"بات یہ ہے کہ مس ہکس۔" ہیوبرٹ نے کہنا شروع کیا۔ "سارا سکول چاہتا ہے کہ میں دوڑ جیتوں اور دو ہفتے کے بعد بڑی دوڑیں میں بھی کچھ کر کے دکھاؤں۔ بائی فیلڈ مجھے زبردستی یہاں سے لے جائیں گے۔"

"شاید مجھے تو وہ لینے نہ آئیں، لیکن میں دوڑوں گا۔" ہومر بولا۔

”مجھے علم نہ تھا کہ تم بھی حصّہ لے رہے ہو؟“ ہیوبرٹ نے پوچھا۔

”اب تو سُن لیا ہے۔“ جواب ملا۔

ہومر التجا کرنے لگا۔ ”مس ہکس۔ ہمیں اس دفعہ معاف کر دیا جائے تو ہم آئندہ کبھی شرارت نہیں کریں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں اور ہیوبرٹ بھی عہد کرتا ہے۔ کیوں ہیوبرٹ۔“

”جی ہاں۔ کرتا ہوں۔“ ہیوبرٹ بولا۔

”تم دونوں سبق کے بعد یہیں بیٹھو گئے۔ ہیلن سبق پڑھو۔“

”پھر جنوب سے کلدانی اور شمال سے میڈی اور ایرانی فوجوں نے اشوریوں کو مغلوب کر لیا۔ اتحادی فوجوں کے سامنے نینوا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بنو کد نصر ثانی نے بابل کی سلطنت سنبھال لی۔ پھر ایرانیوں نے حملہ کیا اور فتح پائی۔ تغیرات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر اس فاتح قوم کی اولاد کو سکندرِ اعظم نے شکست دی۔“

ہومر رات کا تھکا ہوا تھا کچھ ہیلن کی میٹھی آواز کا اثر۔ اس نے بازوؤں میں سر چھپا کر اونگھنا شروع کر دیا۔ لڑکی کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”تاریخ کے اس دور میں دنیا کو نہایت قیمتی ورثہ ملا۔ انجیل میں حضرت موسیٰ کے وضع شدہ قوانین درج ہیں۔ وہ دراصل حمورابی کے وضع کردہ اصولوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان کے علمِ ریاضی میں بارہ کا حاصلِ ضرب استعمال ہوتا تھا۔ اس کا ہندسہ بھی تھا۔ ان سے ہم نے ایک گھنٹے کے ساتھ منٹ اور دائرے کے تین سو ساٹھ حصّے بنائے۔ گنتی کے ہندسے ہمیں عربوں سے ملے، رومن اعداد و شمار سے امتیاز کرنے کے لیے جنہیں اب تک عربی اعداد کہا جاتا ہے۔ اشوریوں نے دھوپ گھڑی ایجاد کی۔ ہم نے راس منڈل کے نشانات اور وہ علامات جو دوا سازی میں استعمال ہوتی ہیں، بابل کے باشندوں سے لیں۔ تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ ایشیائے کوچک میں کھدائی ہوئی تو ایک عظیم الشان سلطنت کے آثار برآمد ہوئے۔“

ہومر غنودگی میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ عظیم الشان سلطنت کہاں تھی؟ اتھیکا میں؟ کیلیفورنیا میں؟ پھر کیا ہوئی؟ اب اس میں نہ عظیم انسان ہیں، نہ ایجادیں، نہ دھوپ گھڑیاں، نہ اعداد و شمار، نہ رات منڈل، نہ کوئی راگ رنگ، نہ کچھ اور۔ کہاں ہے یہ عظیم الشان سلطنت؟

ہومر ہڑبڑا کر اُٹھا اور اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔ جدھر نگاہیں جاتیں ہیلن کا چہرہ سامنے آجاتا۔ سب سے بڑی سلطنت تو یہ چہرہ تھا۔

"حطیطی مصر کے ساحل پر جا پہنچے اور ملک بھر میں پھیل گئے۔ عبرانی خون میں آمیزش کر کے انہوں نے عبرانیوں کو حطیطیوں جیسی ناک عطا کی۔"

ہیلن خاموش ہو گئی۔ سبق ختم ہو گیا تھا۔

"شاباش، ہیلن۔" اُستانی نے کہا۔

انسانی ناک پر ایک تقریر

ہیلن اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اُستانی نے پوچھا۔ ''آج کے سبق سے کیا سیکھا؟''

''یہی کہ دنیا میں ہر شخص کے ناک ہوتی ہے۔'' ہومر نے جواب دیا۔

''اور کیا سیکھا؟''

''اور یہ کہ ناک صرف صاف کرنے یا زکام کروانے کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ تاریخِ قدیم کے سلسلے میں بھی کام آتی ہے۔''

''کوئی اور بچّہ جواب دے۔'' اُستانی نے جماعت کی طرف دیکھا۔

''جی میں تو سبق کی باتیں بتا رہا ہوں۔ ناک اتنی اہم چیز نہ ہوتی تو اس کا ذکر کیوں کیا جاتا۔'' ہومر بولا۔

''تو پھر اُٹھو اور انسانی ناک پر تقریر کرو۔'' اُستانی نے کہا۔

''تقریر تو کیا کر سکتا ہوں لیکن تاریخ کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ

زمانہ ماضی سے لے کر اب تک چہروں پر ناک ہمیشہ رہی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کلاس میں ہر چہرے کے ساتھ ایک ناک ہے۔ چاروں طرف ناکیں ہی ناکیں ہیں۔ ناک انسانی چہرے کا غالباً اہم ترین حصّہ ہے۔ بنی نوع انسان کو جتنا ناک نے پریشان کیا ہے کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ حطیطیوں کی اور بات ہے ان کی ناک بے حد نفیس اور عام ناکوں سے مختلف تھی۔ لیکن دھوپ گھڑی کی ایجاد کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ بعد میں کسی نے اصل گھڑی بنا دی۔ اگر اہم ہے تو بس ایک چیز۔ ناک۔"

مسخرہ جوزف بڑے اشتیاق سے سُن رہا تھا۔ اسے ہومر کی یہ باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں۔

"کچھ لوگ بالکل ناک میں بولتے ہیں، کئی ناک کے ذریعے خرّاٹے لیتے ہیں۔ کچھ ہمیشہ ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ کئیوں کو ناک میں نکیل ڈال کر مطیع کیا جا سکتا ہے۔ انسان ناک گھِس کر منّتیں کرتا ہے۔ توبہ کرتے وقت ناک رگڑتا ہے۔ ناک میں دم آ جائے تو ناک سے تین سیدھی لکیریں کھینچتا ہے۔ خاندان کی ناک بنا رہتا ہے۔ اپنی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا۔ کسی کی بیہودہ حرکت سے خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے۔ موم کی ناک کو جدھر چاہو موڑ لو۔ ناک کا بال ناک سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ بعض لوگ دوسروں کے معاملے میں خواہ مخواہ

اپنی ناک ٹھونس دیتے ہیں۔ ناک ساکن ہے لیکن چہرہ متحرک ہے۔ اس لیے جہاں چہرہ جاتا ہے ناک کو بھی جانا پڑتا ہے۔ ناک صرف سُونگھنے کے لیے ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ناک سے یہ بات کچھ تاڑ جاتے ہیں۔"

ہومر نے ہیوبرٹ کی طرف دیکھا۔ پھر ہیلن کی طرف، جس کی ناک میں ذرا سا خم تھا۔

"ایسے لوگوں کی ناکوں کا رُخ آسمان کی طرف رہتا ہے۔ جیسے ناک کے رُخ ہی تو بہشت جائیں گے۔ ایک دو جانوروں کو چھوڑ کر سب کے نتھنے ہوتے ہیں۔ مکمل ناک فقط انسان کے حصّے میں آئی ہے۔ پھر بھی حیوانوں کی قوّتِ شامہ ہم سے تیز ہے۔ میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ناک ہی فساد کی جڑ ہے۔ اسی سے دوستی ہوتی ہے، لڑائیاں ہوتی ہیں، کُنبوں میں پھوٹ پڑتی ہے۔ جنگوں کی اصل وجہ ناک ہے۔ مس ہکس میں دوڑ میں چلا جاؤں؟"

اُستانی خوش تو تھی کہ چھوٹی سی بات کو ہومر نے کس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کیا، لیکن بچّوں کو قابو میں رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں ہومر، تم یہیں رہو گئے۔ اور ہیوبرٹ تم بھی۔ اچھا اب ناک کو دفع کرو اور جو کچھ پڑھا ہے اس کے متعلق بتاؤ۔"

کلاس خاموش تھی۔

"کچھ تو کہو۔"

مسخرے جوزف نے اُٹھ کر ایک رباعی پڑھی۔

"ناکیں لال لال ہیں

بنفشہ نیلا نیلا ہے

جماعت نیم مُردہ ہے

آپ کا رنگ پیلا ہے"

"کچھ اور؟" اُستانی نے پوچھا۔

"جہازراں اور سیّاح لوگوں کی ناکیں پکوڑے جیسی ہوتی ہیں۔" ایک لڑکی بولی۔

"جڑواں بچّوں کی دو ناکیں ہوتی ہیں۔" جوزف نے کہا۔

"ناک ہمیشہ آگے ہوتی ہے۔ سر کے پیچھے کبھی نہیں ہوتی۔" جوزف کا ایک ساتھی بولا۔

"کچھ اور۔ ؟؟" اُستانی برابر یہی کہے جا رہی تھی۔ "اچھا تم بتاؤ ہنری۔"

"جی میں ناکوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"حضرت موسیٰ کے متعلق تو جانتے ہو؟" جوزف نے ہنری سے پوچھا۔

"ہاں انجیل میں ان کا ذکر ہے۔"

"ان کے ناک تھی یا نہیں؟"

"تو کہہ دو کہ حضرت موسیٰ صاحبِ ناک تھے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ہم تاریخِ قدیم پڑھ رہے ہیں۔ تم لوگ علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔"

"کچھ اور؟" اُستانی نے پھر پوچھا۔

"خیالات اڑتے ہیں، قدم چلتے ہیں اور ناک بہتی ہے۔" جوزف بولا۔

"مس ہکس دوڑ میں جانے کی اجازت دے دیجیے۔" ہومر نے عاجزی سے کہا۔

"مجھے کسی دوڑ ووڑ کی خبر نہیں۔ اچھا کوئی اور؟"

"جی میں نے اتنا کچھ تو کہا ہے ناکوں کے متعلق۔" ہومر بولا۔

”وہ سب مہمل تھا۔“

اتنے میں گھنٹی بجی، بچّے منتشر ہو گئے۔ صرف ہومر اور ہیوبرٹ رہ گئے۔

دوڑ

پرنسپل کے دفتر میں بائی فیلڈ بحث کر رہا تھا۔ آخر پرنسپل نے تنگ آ کر کہا۔ ”مس ہکس سکول کی سب سے قابل اور پرانی اُستانی ہیں۔ انہوں نے مجھے پڑھایا ہے اور تمہیں بھی۔ اگر وہ دو شرارتی لڑکوں کو سزا دینا چاہیں تو میں دخل نہیں دوں گا۔“

”لیکن ہیوبرٹ اکیلے شرارتی لڑکا نہیں ہے۔ ہومر شرارتی ہے۔ مگر ہیوبرٹ بیحد شریف ہے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ وہ شریف گھرانے کا ہے۔ اس کا والد بھی بچپن میں نہایت بھلا لڑکا تھا۔ لیکن مس ہکس اس کی اُستانی ہیں۔ وہ کبھی بلا وجہ سزا نہیں دیتیں۔ ہیوبرٹ پھر کبھی دوڑ لے گا۔“

بائی فیلڈ لاجواب ہو کر دفتر سے نکل آیا۔ لیکن کھیل کے میدان کی بجائے اس نے مس ہکس کے کمرے کا رُخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر دیکھا کہ اُستانی اور دونوں

لڑکے چُپ چاپ بیٹھے ہیں۔

اس نے اُستانی کو سلام کیا اور مُسکرا کر بولا۔ ''مس ہکس میں نے پرنسپل سے بات کرلی ہے۔''

ہومر چھلانگ مار کر اٹھا جیسے بائی فیلڈ اسے ہی تو لینے آیا ہے۔

''تم نہیں۔'' اس نے حقارت سے کہا۔ ''تم مسٹر ایکلے۔''

''اس کا مطلب؟'' اُستانی نے پوچھا۔

''یہی کہ ہیوبرٹ ایکلے دوڑ میں حصّہ لے گا۔ وہاں اس کا انتظار ہو رہا ہے۔''

''اور میں۔ میں مسٹر ہومر میکالے؟'' ہومر نے بائی فیلڈ کی طرف دیکھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہیوبرٹ کو لے کر چلا گیا۔

''دیکھ لیا آپ نے مس ہکس، یہ روایت نہیں تو اور کیا ہے؟''

بیچاری اُستانی آزردہ ہوگئی۔

''بائی فیلڈ کی قسم کے لوگ فقط اپنے جیسے گدھوں کو کھیل کود سکھانا جانتے ہیں۔'' اسے یکلخت خیال آیا کہ مجھے یہ فقرہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ''میں یہ کہنا

چاہتی تھی کہ یہ شخص نہ صرف اکھّڑ ہے بلکہ جھوٹا بھی ہے۔"

اُستانی کو ناراض ہوتا دیکھ کر ہومر نے سوچا کہ اس کی ناراضگی بلاوجہ نہیں ہے اور وہ بہت اچھی اتالیق ہے۔

"مجھے یہ آدمی کبھی اچھا معلوم نہیں ہوا۔ میں بہت خوش ہوں کہ آپ بھی اسے پسند نہیں کرتیں۔"

"مجھے سکول میں پڑھاتے ہوئے پینتیس سال گزر گئے۔ قصبے کے بیشتر باشندوں کو میں نے پڑھایا ہے۔ تمہارا بھائی مارکس اور بہن بیس بھی میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ تمہارے چھوٹے بہن بھائی بھی کبھی میرے شاگرد ہوں گے۔"

"جی میرا تو صرف ایک چھوٹا بھائی ہے۔ یولی سیز۔ مارکس پڑھائی میں کیسا تھا؟"

"مارکس اور بیس دونوں اچھے تھے۔ نیک اور شائستہ۔ اچھے کُنبوں کے بچّے شروع سے اچھے ہوتے ہیں۔ تمہاری طرح مارکس بھی وقت بے وقت بول پڑتا تھا لیکن اس نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔ یہ بائی فیلڈ کے پست طبقے کے لوگ میرے بڑھاپے کی وجہ سے مجھے حقارت سے دیکھتے ہیں۔ یہ شخص جو ابھی سفید جھوٹ بول کر گیا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی جھوٹا تھا۔ سوائے اس کے کہ اپنے سے بڑوں کی چاپلوسی کرے اور اس نے اور کچھ نہیں سیکھا۔"

"جی ہاں۔"

"میں نے ایسے آدمیوں کے ہاتھوں اچھے اچھوں کو بے عزّت ہوتے دیکھا ہے۔ ایسوں کی ساری عمر افترا پردازی اور دھوکہ دینے میں گزر جاتی ہے۔"

اُستانی نے رومال سے آنکھیں پونچھیں۔

"مس ہکس دل برا نہ کریں! میں یہیں بیٹھا رہوں گا۔ مجھے گستاخی کی سزا دیجئے۔ آئندہ کبھی آپ کو ناخوش نہیں کروں گا۔ آج معلوم ہوا ہے کہ اتالیق بھی ہم سب جیسے انسان ہوتے ہیں۔ بلکہ عام انسانوں سے کہیں بہتر۔ مس ہکس آپ جو سزا دیں گی میں بخوشی برداشت کروں گا۔"

"میں تمھیں سزا نہیں دینا چاہتی تھی۔ تمھیں اس لیے روک لیا تھا کہ تم مجھے عزیز ہو۔ ہیوبرٹ کا یہ ہے کہ وہ خود نہیں گیا۔ بائی فیلڈ اسے لے گیا ہے۔ ویسے میں تم دونوں کو ذرا دیر کے بعد چھٹی دے دیتی۔ میرا ارادہ تمھیں تنگ کرنے کا نہیں تھا۔ میں مفید باتیں بتانا چاہتی تھی۔ میں بچّوں کی ذہنی نشو ونما کا مطالعہ کرتی رہتی ہوں۔ انھیں پنپتے دیکھ کر مجھے بڑی مسرّت ہوتی ہے۔ جہاں تم نے ہیوبرٹ سے معافی مانگ کر اسے زیر بار کیا وہاں اس نے فراخدلی سے معاف کر دیا۔ میں تم دونوں سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ تم میں سے ایک شریف کھاتے پیتے گھرانے کا

لڑکا ہے، دوسرا شریف غریب گھرانے کا۔ زندگی کی جدوجہد تمہارے لیے زیادہ کٹھن ثابت ہو گی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم ایک دوسرے کو جاننے لگو۔"

"وہ مجھے ناپسند تو نہیں۔ بس ان کا بے جا غرور کچھ بُرا سا لگتا ہے۔"

"جو تم سوچ رہے ہو میں اسے سمجھتی ہوں۔ دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی سے بہتر ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی اور اس سے بھی بہتر ہوتا ہے۔ جوزف ہیوبرٹ سے زیادہ چست ہے۔ لیکن ہیوبرٹ میں دوسری خوبیاں ہیں۔ جمہوری نظام میں سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ لیکن اس مساوات کی ایک حد مقرر ہے۔ اس سے آگے اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنی کوشش۔ کوئی چاہے تو شریف النفس بن جائے یا احمق بن کر دن پورے کر دے۔ جن بچّوں کو میں پڑھاتی ہوں ان کے ظاہری رکھ رکھاؤ سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اچھے یا بُرے آداب مجھے متاثر نہیں کرتے۔ میں تو ان کا باطن پرکھتی ہوں۔ کوئی بچّہ امیر ہو یا غریب، کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ، گورا ہو یا کالا، ہوشیار ہو یا غبی، چالاک ہو یا سادہ لوح۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے دل میں شرافت اور صداقت ہے یا نہیں۔ چھوٹوں کی عزّت، بڑوں کا احترام۔ اگر یہ موجود ہیں تو پھر میں نہیں چاہتی کہ وہ ایک دوسرے کی نقل کریں اور سب ایک جیسے بن جائیں۔ میں انفرادیت کی قائل ہوں۔ یہ نہیں چاہتی کہ محض مجھے خوش کرنے کے لیے ایک بچّہ

دوسرے جیسا بن جائے۔ اگر ساری کلاس مؤدب بیٹھی ہے تو پڑھانا دوبھر ہو جائے۔ تنوّع نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ ہیوبرٹ بھی یہ سُن لیتا کہ تمہاری باہمی نفرت بالکل معمولی سی چیز ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر تم ایک دوسرے کی عزّت کرتے ہو تو تم دونوں بہت اچھے ہو۔ مہذّب ہونا اس کو کہتے ہیں اور اسی لیے ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔"

ہومر کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔

"بہت اچھا ہوا کہ میں نے تم سے یہ باتیں کر لیں۔ تم سکول سے چلے جاؤ گے، کچھ عرصے کے بعد مجھے بھول جاؤ گے، لیکن میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ جہاں جاؤ گے میری نگاہیں تم پر ہوں گی۔ تمہارے بارے میں اچھی خبریں سُن کر خوشی سے پھولی نہ سماؤں گی۔"

اُستانی نے آنسو پونچھے۔ "اب جاؤ دوڑ میں حصّہ لو۔ ہیوبرٹ کا مقابلہ کرو۔ ورزش کا لباس پہننے کے لیے وقت نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی لباس میں دوڑو۔ لوگ تم پر ہنسیں تو ہنسنے دو۔ زندگی میں کئی مرتبہ تضحیک آمیز قہقہے تمھیں سنائی دیں گے۔ یہ قہقہے صرف تماشائیوں ہی کے نہیں ہوں گے بلکہ تمہارے مقاصد، تمہاری کوششیں، یہاں تک کہ تمہاری منزل بھی تم پر ہنسے گی۔ لیکن مجھے یقین

ہے کہ تم بھی اس کی پروا نہیں کروگے۔"

ہومر میدان میں پہنچا تو دوڑ شروع ہونے والی تھی۔ چار لڑکے جو اکثر مشق کیا کرتے، لائن پر جھکے ہوئے اشارے کے منتظر تھے۔ وہ بھی ساتھ جا کھڑا ہوا۔ دوڑ شروع کرانے والے نے پستول والا ہاتھ اٹھالیا۔

ہومر کے جسم میں ایک دم چستی آگئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ میں نے مشق کی ہے، نہ میرا لباس اور جوتے موزوں ہیں پھر بھی یہ دوڑ جیتنی چاہیے۔

"ابھی دیکھ لینا۔" ہومر نے جواب دیا۔

بائی فیلڈ تماشائیوں میں تھا۔ کسی سے پوچھنے لگا۔ "یہ پانچواں لڑکا کون ہے اور اس نے پہن کیا رکھا ہے؟"

اسے پہچانتے ہی وہ تیزی سے اٹھا کہ ہومر کو باہر نکال دے لیکن فوراً پستول کا دھماکہ ہوا اور دوڑ شروع ہوگئی۔

ہومر اور ہیوبرٹ نے پہلا چوکھٹا تو اکٹھے عبور کیا۔ پھر ہومر آہستہ آہستہ آگے نکلنے لگا۔ دوسرا چوکھٹا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا، ہومر سب سے آگے تھا اور ہیوبرٹ اس کے پیچھے۔ دونوں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔

”اس طرح دوڑنا کب سیکھا؟“ ہیوبرٹ نے پوچھا۔

”اب سیکھ رہا ہوں۔“

”بہت تیزی دکھا رہے ہو۔“

”دوڑ جو جیتنی ہے۔“

”کون کہتا ہے جیتو گے؟“

”میں کہتا ہوں۔“

”رفتار بدل لو۔ لمبی دوڑ ہے تھک جاؤ گے۔ وہ سامنے دیکھنا بائی فیلڈ بھاگا آ رہا ہے۔“

وہ ہومر کی مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ دونوں کی ٹکّر ہوئی اور دھڑام سے گرے۔ ہیوبرٹ فوراً رُک گیا اور دوسرے لڑکوں سے بولا۔ ”سب رُک جاؤ۔ ہومر گر پڑا ہے۔ جب تک وہ نہ اُٹھے ہم نہیں دوڑیں گے۔“

ہومر اٹھا تو پانچوں پھر بھاگنے لگے۔

مس ہکس وہاں کھڑی تھی جہاں دوڑ ختم ہونی تھی۔ سب لڑکوں کو شاباش دے

رہی تھی۔

"بہت اچھے ہومر، شاباش ہیوبرٹ، سام، جان، ہنری۔ شاباش۔"

ہیوبرٹ اب ہومر کے برابر پہنچ کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"گستاخی معاف میں آگے نکل جاؤں؟" ہیوبرٹ نے پوچھا۔

"ہمّت ہے تو نکل جاؤ۔"

ہومر تابڑ توڑ بھاگا۔ دونوں نے ساتھ ساتھ دوڑ ختم کی یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ اوّل کون آیا؟

اُستانی نے لڑکیوں کی تعریف کی۔ "تم سب نہایت اچھی طرح دوڑے۔"

"مجھے معاف کر دیجئے مس ہکس۔ مجھے کمرے میں ٹھہرنا چاہیے تھا۔" ہیوبرٹ بولا۔

"معافی مانگنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بہت اچھا کیا جو ہومر کے گرنے پر تم رُک گئے۔ شاباش۔"

بائی فیلڈ غصّے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اسے چوٹ بھی لگی تھی۔ بھاگا بھاگا آیا اور

دانت پیس کر بولا۔ ”ہومر سزا کے طور پر تمھیں سال بھر تک تمام کھیلوں سے خارج کیا جاتا ہے۔“

”مسٹر بائی فیلڈ ہومر کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟“ اُستانی نے پوچھا۔

”مس ہکس، یہ فیصلہ میں نے خود کیا ہے۔ اس کے لیے میں شعبۂ تاریخِ قدیم سے مشورہ نہیں لینا چاہتا۔ ہومر سمجھ گئے تم؟“

”جی ہاں۔“

”تو جاؤ دفتر میں میرا انتظار کرو۔“

”لیکن مجھے چار بجے کام پر جانا ہے۔ اب کیا بجا ہے؟“

”پونے چار۔“ ہیوبرٹ نے گھڑی دیکھ کر بتایا۔

”جلدی سے دفتر پہنچو۔“

”لیکن کام پر جانا بہت ضروری ہے۔“ ہومر بولا۔

”آخر کیوں انتظار کرے ہومر؟ اس کا قصور؟“ جوزف بھی اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔

بائی فیلڈ جو پہلے سے جھلایا ہوا تھا۔ ”اپنی زبان کو لگام دو۔“

اس نے جوزف کو دھکا دے کر گرا دیا۔

”میرے دوست کو گالیاں دیتے ہو؟“ ہومر، بائی فیلڈ سے گتھم گتھا ہو گیا۔

جوزف پھرتی سے اُٹھا اور بائی فیلڈ پر سوار ہو گیا۔ دونوں لڑکوں نے ڈرل ماسٹر کی خوب تواضع کی۔

پرنسپل بھاگا بھاگا آیا۔ ”حضرات! میرا مطلب ہے لڑکو! یہ کیا حرکت ہے؟“

اس نے بمشکل جوزف کو کھینچ کر علیحدہ کیا۔

بائی فیلڈ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اُستانی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ”مسٹر بائی فیلڈ! تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ کسی پر ہاتھ مت اٹھایا کرو۔“

پھر پرنسپل سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بائی فیلڈ کو جوزف سے معافی مانگنی چاہیے۔“

”کیوں بائی فیلڈ۔“ پرنسپل نے پوچھا۔

”جوزف کا خاندان اٹلی سے آیا تھا۔ وہ شریف لوگ ہیں، انہیں ذلیل کہنے کا کسی

کو حق نہیں ہے۔" اُستانی نے کہا۔

"جی معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔" جوزف بولا۔

"انہوں نے دوبارہ گالی دی تو میں ان سے پھر لڑ پڑوں گا۔ اگر انہوں نے مجھے پیٹا تو میں اپنے بھائیوں کو لے آؤں گا۔"

"جوزف انہیں معافی مانگنے دو یہ تم سے، تمہارے کُنبے سے معافی نہیں مانگ رہے ہیں، بلکہ خود اپنے ملک سے شرمندہ ہیں۔ انہیں موقع دو کہ امریکہ کے باشندے بن کر دکھائیں۔" اُستانی بولیں۔

"درست ہے۔ ہم سب ہم وطن ہیں۔ یہاں صرف وہ لوگ اجنبی ہیں جو بھول جاتے ہیں کہ وہ امریکی ہیں۔" پرنسپل نے کہا۔

ڈرل ماسٹر کو سب گھور رہے تھے۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔" بائی فیلڈ نے جلدی سے کہا اور وہاں سے چل دیا۔

جوزف اور لنگڑاتا ہوا ہومر بھی ایک طرف کو نکل گئے۔ اُستانی اور پرنسپل کو تیس چالیس طلباء گھیرے کھڑے تھے ان میں کئی قوموں کے بچّے شامل تھے۔

اب گھر جاؤ والدین تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بالکل معمولی سی بات تھی۔" اُستانی نے مجمع سے کہا۔

"نہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہنستے کھیلتے گھروں کو سدھارو۔ جنگ بہت جلد ختم ہو جائے گی۔" پرنسپل بولا۔

آہستہ آہستہ مجمع منتشر ہو گیا۔

پھندا

ہومر سکول سے تار گھر کی طرف جا رہا تھا تو بڑی سڑک کی ایک دکان میں ایک موٹا آدمی داخل ہوا جس کی ڈاڑھی بالکل سُرخ تھی۔ اس کا نام کرِس تھا اور وہ پیڈرا کی پہاڑیوں سے شکار کا سامان خریدنے آیا تھا۔

دکان کے مالک نے اسے ایک نئی وضع کا پھندا دکھایا جسے کسی نے ابھی ابھی ایجاد کیا تھا۔ یہ پھندا کافی بڑا اور پیچیدہ سا تھا۔ فولاد، لکڑی، رسّے، کمانیاں نہ جانے کیا کچھ اس میں لگایا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جانور پھنستے ہی ہوا میں معلّق ہو جاتا اور اچھل کود نہ سکتا۔

دُکاندار نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ ”جناب بالکل نئی چیز ہے۔ موٴجد نے صرف دو پھندے بنائے ہیں۔ ایک تو پیٹنٹ کرانے کے لیے بھیجا ہے۔ دوسرا یہ ہے۔ چوپایہ کیسا ہی ہو، یہ اسے منٹوں میں پھانس لے گا۔ قیمت بیس ڈالر۔ اسے بارہا آزمایا جا چکا ہے۔ دیکھئے مضبوط کتنا ہے۔ ایک بڑے سارے ریچھ کو بخوبی

تھام سکتا ہے۔"

موٹا کرِس بڑے شوق سے سُن رہا تھا۔ پیچھے یولی سیز کھڑا آڑ لیے جھانک رہا تھا۔ دکاندار نے سمجھا کہ بچّہ گاہک کا ہے۔ کرِس اسے دکاندار کا لڑکا سمجھ رہا تھا۔ اس لیے یولی سیز سے کسی نے کچھ نہ کہا۔

ادھر یولی سیز کا یہ خیال تھا کہ جہاں کوئی تماشا ہو وہاں چھوٹے بچّوں کو فوراً پہنچ جانا چاہیے۔

"اور لطف یہ ہے کہ جانور زخمی نہیں ہوتا۔ کھال اور سمور بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ گیارہ برس کی گارنٹی ہے۔ لکڑی کی عمدگی، کمانیوں کی لچک، رسّوں کی مضبوطی۔ سب کی گارنٹی ہے۔ موٗجد نہ شکاری ہے، نہ جانوروں کو ایذا پہنچانے کا قائل ہے۔ اس نرم دل، خداترس بزرگ نے یہ کارآمد پھندا اس لیے بنایا ہے کہ جانوروں کو تکلیف نہ پہنچے۔ ستّر برس کی عمر میں موٗجد نے سینتیس مفید چیزیں ایجاد کیں۔" دکاندار نے کُل پرزے کسے۔ "اب پھندا تیار ہے۔"

یولی سیز سرکتا سرکتا قریب پہنچ چکا تھا۔ آگے جو بڑھا تو بالکل مشین سے جا لگا۔ پھندے نے جلدی سے یولی سیز کو اٹھا کر گھمایا اور دیکھتے دیکھتے وہ ہوا میں لٹکنے لگا۔ اس کے چہرے پر نہ ڈر تھا نہ تشویش بڑے مزے سے لیٹا ہوا تھا۔

موٹا کرِس گھبرا گیا۔ ”دیکھنا تمہارے بیٹے کو چوٹ نہ آ جائے۔“

”میرا بیٹا؟ آج پہلی دفعہ اسے دیکھا ہے۔ میں تو اسے تمہارا لڑکا سمجھتا رہا ہوں۔“

”اچھا؟ خیر کسی کا بھی ہو۔ جلدی سے اسے باہر نکالو۔“

”ابھی نکالتا ہوں۔ پر تمہارا نام کیا ہے؟“ کرِس نے پوچھا۔

”یولی سیز۔“

”اور میں موٹا کرِس ہوں۔ تم ذرا دیر چپ چاپ لیٹے رہو۔ ابھی تمہیں باہر نکال دیں گے۔“

دوکاندار بوکھلا گیا۔ ”شاید پرچہ ترکیبِ استعمال میں کھولنے کا طریقہ درج نہیں تھا۔ لیکن اسے کھولا تو تھا ایک دن۔ بات یہ ہے کہ جب موٗجد یہاں آیا تو اس وقت کوئی جانور ہی نہیں ملا کہ اس پر مشق کر لیتے۔ یہ تو کھلتا ہی نہیں۔“

وہ دونوں جٹے ہوئے تھے۔ موٹے کرِس نے بچے کو تھام رکھا تھا کہ پھندا اچانک کھلے تو بچّہ مُنہ کے بل نہ گر پڑے۔ دکاندار باری باری ایک ایک پرزے کو مروڑتا کہ کچھ تو ملے۔

”ذرا جلدی کرو۔ کب تک بچے کو لٹکائے رکھو گے۔ بیٹے تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟“

”جی نہیں۔“

”تم اس میں پھنس کیسے گئے؟“

”جی میں تو یونہی دیکھ رہا تھا۔“

”یہ کم بخت پھندا دیکھنے میں بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ بیٹے تمہاری عمر کیا ہے؟“

”چار برس کا ہوں۔“

”والد کا کیا نام ہے؟“

”میتھیو۔“

”وہ بڑے خوش نصیب ہیں کہ ایسا اچھا بیٹا ملا۔ کاش کہ میرا بھی ایسا لڑکا ہوتا۔ عجیب بات ہے۔ مجھے موزوں بیوی ہی نہیں ملی۔ تیس سال ہوئے اوکلاہوما میں ایک لڑکی ملی تھی لیکن وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ کیوں بھئی کتنی دیر لگے گی؟“

"پتا نہیں۔ مؤجد نے جانور کو باہر نکالنے کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔ دراصل یہ پھندا جانوروں کے لیے ہے۔نہ جانے چھوٹے بچّوں کو کیوں کر نکالا جاتا ہے۔"

ایک عورت ایک بچّی ساتھ لیے آ کھڑی ہوئی۔ دو مرد اور دو لڑکے بھی تماشا دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟" ایک نے پوچھا۔

"بچّہ اس پھندے میں پھنس گیا ہے۔" دکاندار نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ؟"

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں چوٹ نہیں لگی۔" دُکاندار بولا۔

"تو پھر پولیس کو بلاتے ہیں۔" عورت بولی۔

"نہیں پولیس کی ضرورت نہیں۔ ابھی پھندا کھل جائے گا۔"

"کتنی شرم کی بات ہے کہ ننھے مُنّے بچّوں کو ایسی بیہودہ مشینوں سے ایذا پہنچائی جاتی ہے۔"

"محترمہ! بچّے کو ایذا نہیں پہنچی۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"اگر یہ بچہ میرا ہوتا تو منٹوں میں پولیس کو اطلاع دے دیتی۔"

عورت بچّی کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔ بچّی زور زور سے چلا رہی تھی۔ "میں تماشا دیکھوں گی۔ امّی میں تماشا دیکھوں گی۔"

اب دکاندار بالکل تھک چکا تھا۔

"مجھ سے یہ نہیں کھلتا۔ مؤجد کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔"

"اور میں یہیں لیٹا رہوں؟" یولی سیز نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ ابھی تمہیں نکالتے ہیں۔" موٹا کرِس بولا۔

ایک لڑکا بغل میں اخباروں کا بھنڈل دبائے آیا۔ وہ کبھی پھندے کو دیکھتا، کبھی ہجوم کو۔ اس نے بچّے کو پہچان لیا۔

"یولی سیز! یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"آگی! میں پھنس گیا ہوں۔"

"کیسے؟"

"بس یونہی۔"

اخبار والے نے کرِس کا ہاتھ بٹانا چاہا لیکن کچھ نہ بنا۔ وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا۔ پھر گلی کی طرف بھاگا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں ہومر نہ ملا تو دوسری گلی میں نکل گیا۔ لوگوں سے ٹکراتا ہوا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ ایک چوک میں ہومر کو ڈھونڈنے لگا۔ اور اچانک اسے ہومر نظر آ گیا۔ اس نے چلّا کر اسے آواز دی اور پیچھے بھاگا۔

"ہومر! میرے ساتھ آؤ۔"

ہومر نے سائیکل سے اتر کر پوچھا "آگی! کیا بات ہے؟"

"کچھ ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔"

"لیکن ہوا کیا؟"

"وہ جو دکان ہے نا۔ وہاں چلو"

"کوئی نئی چیز دکھاؤ گے؟ مچھلیاں پکڑنے کا سامان یا کوئی بندوق؟ مجھے بالکل فرصت نہیں ہے، کام کرنا ہے۔"

ہومر سائیکل پر بیٹھ کر چلنے لگا۔ آگی نے بھاگ کر سائیکل پکڑ لی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ابھی۔ اس وقت وہ پھندے میں ہے۔"

"پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو۔ اچھا چلو۔"

دونوں دکان پر پہنچے۔ وہاں بہت سے تماشائی کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہومر ڈر سا گیا۔

مشکل سے براستہ بنا کر اندر پہنچے۔

"یولی سیز!" ہومر چلایا۔

"بھائی جان!"

"میرے بھائی کو کیا ہو گیا؟" ہومر نے پوچھا۔

"وہ ذرا پھنس گیا ہے۔" دکاندار نے بتایا۔

"اور یہ ہجوم یہاں کیا کر رہا ہے۔ جایئے آپ لوگ اپنے گھروں کو جایئے۔"

"ایک بچّہ پھندے میں پھنس جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خلقت تماشا دیکھنے آ کھڑی ہو۔"

دوکاندار آگے بڑھا۔ "آپ میں سے جو گاہک نہیں ہیں، ازراہِ کرم تشریف لے

جائیں۔"

"مسٹر ویلیس آپ بے شک ٹھہر جائیے۔ مسٹر سیکرٹ، جارج، سپنڈل، شارٹی۔ آپ بھی۔"

"اور میں؟ میں بھی تو آپ کا گاہک ہوں۔ پچھلے ہفتے ہی میں نے چیزیں خریدی تھیں۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"ہاں مجھے یاد آ گیا۔ باقی کے سب چلے جائیں۔"

ہجوم میں سے صرف دو تین نے ذرا جنبش کی۔

"یولی سیز۔ گھبراؤ مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ آگی نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ آگی تار گھر جا کر مسٹر سپنگلز سے کہنا کہ میرا بھائی پھندے میں پھنس گیا ہے۔ اسے نکال کر فوراً پہنچ جاؤں گا۔"

آگی بھاگا۔ راستے میں پولیس کے سپاہی سے ٹکّر ہوئی۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ایک بچّہ پھندے میں پھنس گیا ہے، نکلتا ہی نہیں۔"

”ذرا میں بھی دیکھوں۔“

سپاہی نے پھندے کا معائنہ کیا اور ہجوم سے مخاطب ہوا۔

”اپنا اپنا راستہ لیجئے۔ ایسی باتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں، جایئے اپنا کام کیجئے۔“

بڑی مشکل سے سپاہی نے لوگوں کو باہر نکال کر دروازہ بند کیا۔

”جناب آپ نے میری دکان ساڑھے چار بجے ہی بند کرا دی۔“ دوکاندار نے احتجاج کیا۔

سپاہی نے اس کی بات اَن سُنی کر دی اور پوچھا۔

”یہ کس قسم کا پھندا ہے؟“

”بالکل نئی چیز ہے۔ ابھی ابھی ایجاد ہوا ہے۔ قیمت صرف بیس ڈالر۔ عنقریب پیٹنٹ ہو جائے گا۔“

”جلدی سے میرے بھائی کو اس میں سے نکالئے یا مؤجد کو بلایئے۔“ ہومر نے کہا۔

”میں نے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹیلی فون خراب ہے۔“

"یہ بھی ایک ہی رہی۔" ہومر طیش میں آ کر بولا۔ "موجد کو پکڑ کر لائیے۔"

"ہاں جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے۔" سپاہی نے لقمہ دیا۔

"جناب میں ایک شریفانہ کاروبار کرتا ہوں۔ نیک شہری ہوں اور ٹیکس ادا کرتا ہوں جس سے آپ کو تنخواہ ملتی ہے۔ کہہ تو رہا ہوں کہ کوشش بہت کی مگر ٹیلی فون خراب ہے۔ اب میں دن دہاڑے دکان کھلی چھوڑ کر کسی کے پیچھے جانے سے رہا۔"

ہومر غرایا اور اپنی انگلی دکاندار کی ناک سے تقریباً چھوا کر بولا۔ "اسی وقت مؤجد کو بلا کر اس شیطانی چرخے کو کھلواؤ۔"

"یہ شیطانی چرخہ ہر گز نہیں ہے۔ جانور پکڑنے کا اس سے بہتر پھندا آج تک نہیں بنا۔ نہ جانور کو چوٹ لگتی ہے نہ کھال اور سمور خراب ہوتے ہیں۔ مشین جانور کو حفاظت سے ہوا میں لٹکا دیتی ہے تاکہ شکاری کو باندھنے میں آسانی رہے۔"

"اسے ہم آری سے نہ کاٹ ڈالیں۔" سپاہی نے مشورہ دیا۔

"جناب یہ فولاد ہے۔ آسانی سے نہیں کٹے گا۔" دکاندار نے بڑے فخر سے کہا۔

"یولی سیز کسی چیز کو جی چاہتا ہو تو لے آؤں؟" ہومر نے اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

موٹا کرِس کبھی یولی سیز کے پُر سکون چہرے کو دیکھتا کبھی ہومر کے لال لال منہ کو۔

وہ دونوں بھائیوں کی محبّت سے بڑا متاثر ہوا۔

"یولی سیز تمہیں کچھ چاہیے؟"

"ابّا جان۔"

"ابّا کے سوا کچھ اور؟"

"مارکس۔"

"مارکس تو فوج میں ہے۔ ملائی کی برف یا مٹھائی لاؤں؟"

"نہیں مجھے صرف مارکس چاہیے۔"

موٹا کرِس آستینیں چڑھا کر آگے بڑھا۔ "برخوردار اپنے بھائی کو تھامے رکھنا میں کچھ کرنے لگا ہوں۔"

دکاندار چلایا۔ ''تم اسے توڑ رہے ہو۔ دنیا بھر میں یہ اپنی قسم کا واحد پھندا ہے۔ ایسی نایاب چیز کو تباہ کرو گے۔ اس کا موجد ضعیفی کی وجہ سے شاید پھر ایسا پھندا نہ بنا سکے۔ تھوڑا سا انتظار کرو۔ ایک دو گھنٹے میں موٗجد ضرور یہاں آ جائے گا۔''

''ایک دو گھنٹے میں۔'' ہومر چنگھاڑا۔ ''میں ساری دکان توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ مسٹر کرِس آپ اسے بے شک توڑ ڈالیے۔''

کرِس پھندے سے کشتی لڑ رہا ہے۔ اس کے بازوؤں اور کندھوں کے پٹھے ابھر آئے تھے۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ مشین نے قوّت کے آگے جواب دے دیا۔

یولی سیز اب آزاد تھا۔ ہومر نے اسے بازوؤں میں لے کر فرش پر کھڑا کر دیا۔

دکاندار نے چِڑ کر موٹے کرِس کی طرف دیکھا۔ ''پھندا تو بالکل بیکار ہو چکا ہے اس کی قیمت کون دے گا۔''

کرِس نے جیب سے نقدی نکالی اور بیس ڈالر گِن کر میز پر پھینک دیئے۔ یولی سیز کو بڑی محبّت سے تھپتھپایا، بالکل اس طرح جیسے باپ بیٹے کو پیار کرتا ہے اور دکان سے باہر چلا گیا۔

"ننھے تم ایسی مصیبتوں میں کیسے گرفتار ہو جاتے ہو!" ہومر نے بھائی سے کہا اور مشین کو زور سے ٹھکرایا۔

"ذرا احتیاط سے۔" سپاہی بولا۔ "یہ نئی ایجاد ہے کوئی نئی مصیبت نہ اُٹھ کھڑی ہو۔"

"خواتین و حضرات! ہماری دکان سنیچر کو چھوڑ کر ہر روز آٹھ بجے صبح سے سات بجے شام تک کھلی رہتی ہے۔ سنیچر کو دس بجے تک کاروبار ہوتا ہے۔ اتوار کو چھٹی۔ ہمارے ہاں شکار کا سب سامان موجود ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کی ڈور، بندوقیں کارتوس وغیرہ وغیرہ۔ آیئے تشریف لایئے۔ دکان کھلی ہے۔"

لوگ فوراً اِدھر ادھر ہو گئے۔

ہومر نے سپاہی سے پوچھا۔ "یہ موٹا آدمی کون تھا؟"

"پتا نہیں کون تھا۔"

"یہ موٹا کرِس تھا۔" یولی سیز نے بتایا۔

"اچھا! اس کا یہ نام ہے؟"

آگی نے آکر سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔

"یولی سیز کیسے باہر نکلا؟"

"موٹے کرِس نے نکالا۔"یولی سیز نے جواب دیا۔

"پھندے کو کیا ہوا؟ اسے کس نے توڑا؟ سرخ ڈاڑھی والا وہ مضبوط سا آدمی کہاں گیا؟"

"یہ بتاؤ تم نے سپنگلز کو پیغام پہنچا دیا تھا؟"

"ہاں۔ مگر یہ پھندا کیسا نکلا؟ جانور پکڑ لیتا ہے یا نہیں؟"

"بالکل بیہودہ چیز ہے۔ جانور پھانسنے کا کیا فائدہ اگر وہ ساری عمر پھندے ہی میں اٹکا رہے۔ اور جناب دکاندار صاحب ایسے کباڑ کے لیے بیس ڈالر آپ نے مانگ لیے۔"

"اس کی قیمت ہی یہ ہے۔"

"قیمت ہی یہ ہے۔ چلو آگی یہاں سے چلیں۔"تینوں تار گھر پہنچے۔ گروگن تار کی مشین پر بیٹھا تھا۔ سپنگلز کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

"مسٹر سپنگلز یہ میرا چھوٹا بھائی یولی سیز ہے۔ یہ پھندے میں آ گیا تھا۔ موٹے کرِس نے مشین توڑ کر باہر نکالا۔ بے چارے نے بیس ڈالر بھی دیئے۔ یہ میرا دوست آگی ہے۔ اس کے ہاتھ میں نے پیغام بھجوایا تھا۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ چند تار تقسیم کرنے ہیں۔" سپنگلز نے کہا۔

یولی سیز اور آگی تار کی مشین کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔

"چار پانچ جگہ سے بلاوا آیا تھا۔ قریب کی جگہوں پر تو میں ہو آیا۔ دو ایک جگہ باقی ہیں۔ پہلے وہاں چلے جاؤ۔ پھر تار بانٹ لینا۔"

"جی بہت اچھا۔ دیر میں آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ابھی منٹوں میں سب کام کر دوں گا۔ بچّے کو یہیں چھوڑ جاؤں؟"

"تم جاؤ بچّہ میرے پاس رہے گا۔"

"شکریہ! یولی سیز شرارت نہیں کرے گا۔ بس چپ چاپ بیٹھا رہے گا۔"

ہومر لنگڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

ڈائنا

یولی سیز اور آگی ٹکٹکی باندھے تار کی مشین کو دیکھ رہے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ آگی نے پوچھا۔

”مسٹر گروگن تار بھیج رہے ہیں۔“ سپنگلز نے جواب دیا۔

”کہاں؟“

”اتنی دور تار کیسے چلا جائے گا؟“

”وہاں تک تار کے کھمبے لگے ہوئے ہیں۔“

”کھمبے اتنی دور تک لگے ہوئے ہیں؟“

”تار کون لوگ بھیجتے ہیں؟“

”سب بھیجتے ہیں۔“

”مجھے تو کسی نے نہیں بھیجا۔ تار کیسے آتا ہے؟“

”کوئی بھیج دے تو آجاتا ہے۔“

”مجھے کون بھیج سکتا ہے؟“

”کوئی دوست یا عزیز۔“

”میرے سب دوست اور عزیز تو اسی قصبے میں رہتے ہیں۔ یہ سبز روشنی کس لیے ہے؟“

”یہ ظاہر کرتی ہے کہ لائن خالی ہے۔“

”کون کسی لائن؟“

”سان فرانسسکو والی۔“

”اچھا ہرکارہ بننے کے لیے کتنی عمر ہونی چاہیے؟“

”سولہ برس۔“

”میں نو برس کا ہوں۔ آپ سولہ برس کہتے ہیں۔ سترہ کے ہو کر تو سب بحری فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں۔“

”حکومت نے یہی عمر مقرر کی ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ مشقت تھکا دیتی ہے۔ بچّے آرام نہیں کر سکتے۔ کھیل نہیں سکتے۔ حکومت بچّوں کی حفاظت کرتی ہے۔

بچّوں کو مزدوری سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ لوگ بچّوں کو ملازم رکھ کر ان پر حکم نہیں چلا سکتے۔“

”اور اگر کوئی بچّہ حفاظت نہ چاہے، کام کرنا چاہے تو؟“

”اس کی بھی حفاظت کی جاتی ہے۔“

”لفظ بچّہ کب تک ساتھ لگا رہتا ہے؟“

”پتا نہیں۔ لیکن ہرکارہ بننے کی عمر سولہ برس ہے۔“

”اور ہومر جو ہرکارہ ہے وہ کون سا سولہ کا ہے؟“

”اس سے خاص رعایت کی گئی ہے۔ وہ نہایت ذہین اور چُست لڑکا ہے۔“

”لیکن ہرکارے کو ذہانت کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت تو نہیں لیکن ذہین ہو تو اچھا ہے۔“

”وہ کیسے پتہ چلتا ہے فلاں ذہین ہے؟“

”چند منٹ باتیں کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔“

”یہ آپ کاغذوں کی ڈھیریاں کیوں بنا رہے ہیں؟“

”یہ وہ تاریں ہیں جو کل ہم نے بھیجے تھے۔ میں انہیں چھانٹ رہا ہوں۔ ہر شہر کی مختلف ڈھیری ہے۔ مثلاً یہ سان فرانسسکو کے تار ہیں۔“

”یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ میں سائیکل بھی چلا سکتا ہوں اگرچہ میرے پاس سائیکل نہیں ہے۔ جب ہوئی تو آپ مجھے ہرکارہ رکھ لیں گے۔“

”ہاں آگی تم چودہ سال کے ہو جاؤ گے تو ضرور رکھ لیں گے۔“

”اور جب بارہ برس کا ہوں گا تب؟“

”تب دیکھا جائے گا۔ ہرکارہ کیوں بننا چاہتے ہو؟“

”نئی نئی باتیں سیکھوں گا، تجربے میں اضافہ ہو گا۔ لیکن بارہ برس کا ہونے کے لیے تو ابھی تین برس انتظار کرنا پڑے گا۔“

"تین سال تو یوں گزر جائیں گے، پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"مدّتوں سے دِن گِن رہا ہوں کہ کسی طرح بڑا ہو جاؤں۔"

"دیکھ لینا تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور بارہ برس کے ہو جاؤ گے۔ تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"آگسٹس گوٹکلیب۔"

"اچھا آگسٹس وعدہ رہا، وقت آنے پر۔"

سپنگلز نے فقرہ پورا نہ کیا تھا کہ ایک لڑکی دوڑتی ہوئی اندر آگئی۔ یہ ڈائنا سٹیڈ تھی۔ جو ابھی ابھی کار سے اُتری تھی۔

"اچھا ہوا تم مل گئے۔" اس نے سپنگلز کو بازوؤں میں دبوچ لیا۔

"ذرا ٹھہرو۔" سپنگلز اسے ایک طرف ہٹا کر کاغذات سمیٹنے لگا۔

لڑکی نے پھر اسے پکڑ لیا۔ سپنگلز نے بمشکل اپنے آپ کو چھڑایا۔

"ٹھہرو تو سہی۔ یہ اندر رکھ لوں۔ اتنے میں آگسٹس سے باتیں کرو۔"

"آگی ان سے ملو۔ یہ مِس سٹیڈ ہیں۔"

"ہیلو" ڈائنا نے کہا۔

"ہیلو" کہہ کر آگی سوچنے لگا کہ اور کیا کہے۔

"آپ اخبار لیں گی۔"

"ضرور لوں گی۔ کتنے کا ہے؟"

"پانچ سینٹ کا۔ گھڑ دوڑ کی خبریں، بازار کے بھاؤ، جنگ کا حال سب کچھ اس میں ہے۔"

ڈائنا نے پانچ سینٹ نکالے۔ آگی نے پھرتی سے اخبار تہہ کیا۔

"یہ لیجئے۔ بدھ کو میرے پاس ایرننگ پوسٹ اور لبرٹی بھی ہوتے ہیں اور جمعے کو کولئر۔ میں قصبے بھر کو پرچے دیتا ہوں۔"

"اچھا۔ پھر تو تم کافی کما لیتے ہو گے۔"

"کوئی چالیس سینٹ روزانہ بچ ہی جاتے ہیں۔ جب میلا لگے گا تو میں سوڈا بیچوں گا۔"

"بڑے محنتی لڑکے ہو۔" ڈائنا کی آواز بہت پیاری تھی۔

"جی میں نئی نئی باتیں سیکھتا رہتا ہوں۔ انسان کو دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں۔" آگی نے یہ فقرہ اس طرح کہا جیسے وہ ڈائنا کو دیکھتے ہی پہچان گیا ہے کہ بہت اچھی لڑکی ہے۔

لڑکی سپنگلز سے کہہ رہی تھی۔ "میں نے تمہارا اتنی دیر انتظار کیا تم نے وعدہ کیا تھا کہ پانچ بجے آؤ گے، دیکھو اب کیا بجا ہے۔"

"میں بھول گیا۔ آگی سے باتیں ہو رہی تھیں۔ خیال نہیں رہا۔ اسے ہر کارہ بننے کا شوق ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ وقت آنے پر اسے ضرور رکھ لیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ اچھا خدا حافظ مسٹر سپنگلز، مس سٹیڈ، خدا حافظ یولی سیز۔"

آگی چلا گیا۔

"یولی سیز۔" ڈائنا خوش ہو کر بولی۔ "کتنا پیارا نام ہے۔ اتھیکا میں یولی سیز۔"

"لیکن تم نے پانچ بجے آنے کا وعدہ کیا تھا اور نہیں آئے۔ آج شام کھانے پر تو آؤ گے نا؟"

"امّی اور ابّا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ شام کے سات بجے۔"

"ٹھہرو تو سہی۔ میری بھی تو سُنو۔"

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔ ایک مرتبہ تو انتظار کرا لیا، اب پھر مایوس کرو گے؟"

"تمہیں کبھی مایوس نہ ہونے دوں گا۔ لیکن یہ دعوت پر بلایا کیوں جا رہا ہے؟"

"اس لیے کہ مجھے تم سے محبّت ہے۔" ڈائنا نے اس طرح کہا جیسے سپنگلز چھوٹا سا بچّہ ہو۔ "تم سے محبت ہے! محبت ہے! محبت ہے!"

"کچھ تو خیال کرو۔ جب ایسی گفتگو ہوتی ہے میں۔"

"لیکن مجھے سچ مچ محبّت ہے۔"

"آج تک میں صرف دو دفعہ دعوتوں میں گیا ہوں اور دونوں مرتبہ سخت بیزار ہوا۔"

"لیکن اس دعوت میں بیزار نہیں ہو گے۔ وہاں صرف امّی اور ابّا ہوں گے جو یقیناً تمہیں پسند کریں گے۔ تمہیں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا ہو گا۔ فقط شام کا سیاہ لباس پہننا ہو گا۔ تو پھر پورے سات بجے۔ یہ سفید سی چیز کیا ہے؟"

"اُبلا ہوا انڈا ہے۔ خوش نصیبی کی نشانی۔"

”تمہاری یہی باتیں تو مجھے پسند ہیں۔ اچھا میں چلوں۔ جلدی گھر پہنچنا ہے۔“

گروگن تار ٹائپ کر چکا تھا۔ سپنگلز نے بچّے کو اس کے حوالے کیا۔ ”ولی! میں ذرا کاربٹ کی دکان تک ہو آؤں۔ اس کا خیال رکھنا۔ یہ ہومر کا چھوٹا بھائی ہے۔ بیچارہ کسی پھندے وغیرہ میں پھنس گیا تھا۔ یولی سیز، یہ مسٹر ولی گروگن ہیں۔“

”ہم تو پرانے دوست ہیں۔ کیوں ننھے؟“

یولی سیز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اکیلی لڑکی

سپنگلز باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مشین کھٹ کھٹ کرنے لگی۔ پیغام خودبخود ٹائپ ہونے لگا۔ اس نے الفاظ پڑھے۔ ”بڑے تار گھر والے بلا رہے ہیں۔ ہومر واپس آئے تو اسے بٹھا لینا، دوسرے تار گھر سے بھی اطلاع آئے گی۔ ہومر چاہے تو ویسٹرن یونین کے ہرکارے کو آج پھر ہرا سکتا ہے۔ کل کتنے تار ملے تھے؟“

”سڑسٹھ۔“ گروگن نے بتایا۔

”اڑسٹھ میں سے سڑسٹھ ہمیں ملے کیوں کہ ہومر پہلے پہنچا۔ جو ہرکارہ دیر میں پہنچے اسے صرف ایک تار ملتا ہے۔ میں ذرا کاربٹ کی دکان تک ہو آؤں۔“

مشین پھر کھڑ کنے لگی۔ یہ دوسرے تار گھر والے تھے۔

”آج میں پہلے پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

سپنگلز سرپٹ بھاگا۔ اتنی تیزی سے جیسے سنٹر فارورڈ گیند لیے گول کرنے جارہا ہو۔ نکّڑ پر ایک لڑکی نظر آئی۔ حسین، پژمردہ اور خاموش۔ اکیلی کھڑی غالباً بس کا انتظار کر رہی تھی۔ سپنگلز کا دھیان کسی اور طرف تھا۔ لیکن لڑکی کی اداسی نے اسے متوجہ کر لیا۔ ایک انجانی کشش سے مغلوب ہو کر وہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور بڑی بے ساختگی سے لڑکی کو چوم لیا۔ ”تم سی حسین لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔“ یہ کہہ کر وہ بگٹٹ بھاگا۔ جب تار گھر کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا تو دوسرا ہرکارہ سڑک پر اپنی سائیکل رکھ رہا تھا۔ سپنگلز دفتر میں داخل ہوا تو دوسرا ہرکارہ بجلی کی لفٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

”میں محکمہ ڈاک کے تار گھر سے آیا ہوں۔“ سپنگلز نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

”ٹام تم پھر ہرکارے بن گئے ہو؟“ اندر سے بوڑھی عورت نے پوچھا۔

”جو ایک مرتبہ ہرکارہ بن جائے عمر بھر ہرکارہ رہتا ہے۔ لیکن دراصل میں تو تمھیں ملنے آیا کرتا ہوں مسز بروکنگٹن۔“

”دوسرے ہرکارے نے صدا لگائی۔ ویسٹرن یونین۔“

”ہیری آج تم پھر دیر سے پہنچے“ عورت نے صرف ایک تار اسے دیا۔

ہرکارہ سوچنے لگا کہ حریفوں نے آج پھر ہرا دیا۔ لیکن یہ اطمینان تھا کہ اس مرتبہ ہو مرنے نہیں خود منیجر نے ہرا دیا ہے۔ اس نے مسز بروکنگٹن کو سلام کیا اور چلا گیا۔

عورت نے کاغذوں کا بنڈل سپنگلز کے حوالے کیا۔ ”لو ٹام، پورے ایک سو انیتس پیغام ہیں۔ ایک بھی بیئرنگ نہیں۔“

”ایک سو انیتس۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی۔“ سپنگلز نے آگے بڑھ کر عورت کو چوم لیا۔

”ٹام کیا کرتے ہو؟“ عورت نے خوش ہو کر کہا۔

”بیس سال ہوئے ہیں میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ یاد ہے جب میں پہلی مرتبہ ہرکارہ بن کر آیا تب سے یہ خواہش تھی کہ تمہیں چوم لوں۔ اتنے طویل عرصے میں تمہاری خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔“

”ٹام بوڑھیوں کو نہیں چھیڑا کرتے۔“

”کون کہتا ہے کہ تمہارے حسن میں تغیر آگیا ہے؟“

”تم بڑے اچھے ہو۔ تمہارا نیا ہرکارہ بھی اچھا ہے۔ آج وہ نہیں آیا؟“

”ہومر؟ آج اس کا بھائی کسی پھندے میں پھنس گیا تھا۔ اسے دیر ہو گئی۔ اب وہ ہر روز آیا کرے گا اور سب سے پہلے پہنچے گا۔ خدا حافظ ایملی۔“

”تمہیں میرا پہلا نام بھی یاد ہے؟“

سپنگلز واپس آتے وقت بے حد مسرور تھا۔ ہومر نے اپنے بھائی کو پھندے سے چھڑا لیا۔ گروگن ضعیفی کے باوجود کام کرتا ہے۔ آگی ہرکارہ بننے کے لیے بڑی پھرتی سے بڑا ہو رہا ہے۔ ڈائنا سٹیڈ مجھے چاہتی ہے۔ اور وہ غمگین سی حسینہ جو اکیلی کھڑی تھی۔ اسے یاد آیا۔ یہی جگہ تھی جہاں وہ بس کا انتظار کر رہی تھی۔ پتا نہیں وہ پھر ملے گی یا نہیں۔ اگر ملی تو کیا اتنی دلکش معلوم ہو گی؟

وہ سیٹی بجاتا ہوا کاربٹ کی دکان میں داخل ہوا۔ اندر پرانا والز ”تمہارے سوا مجھے کچھ نہیں چاہیے“ بج رہا تھا۔

بار پر کاربٹ کھڑا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی سکاچ وہسکی انڈیلی اور پانی ڈال کر گلاس سامنے رکھ دیا۔

”ہلو رالف۔ کیا حال ہے؟“

”نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ ان دنوں سپاہی بہت آتے ہیں۔ ان کے پاس فرصت زیادہ

ہوتی ہے۔ اور رقم کم۔ میں ان سے خاص رعایت برتتا ہوں۔ ان کی جیب خالی ہو تو کبھی کبھار اپنے پاس سے کچھ دے دیتا ہوں۔"

"اس طرح نقصان نہیں ہوتا۔"

"ہوتا تو ہے لیکن جنگ کے بعد شاید نفع کما سکوں۔ دراصل مجھے کاروبار چلانا نہیں آتا۔ میں دکاندار ہرگز نہیں ہوں۔ ینگ کاربٹ ہوں جو کبھی مکّہ باز تھا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ پریشان سا تھا چہرے پر تفکّر کے آثار نمایاں تھے۔

"ٹام یہ کل کی بات ہے۔ شام کو میں کام میں مصروف تھا۔ یکایک ایک آدمی چلّایا۔ 'ابے او بہروپئے، شراب دے'، وہ سپاہی نہیں تھا بلکہ مقامی باشندہ تھا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ شاید کسی اور سے مخاطب ہے۔ لیکن بار پر میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ 'بہروپئے! کیا تو نے مجھ سے کلام کیا ہے؟' میں نے پوچھا۔ 'ہاں ہاں بہروپئے تجھ ہی سے تو مخاطب ہوں۔ شراب لا جلدی سے۔' اور میرا خون کھولنے لگا۔ اب ایسے مریل بسے ہوئے آدمی سے میں کیا کہتا۔ اسے پیٹنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں مکّہ باز رہ چکا ہوں۔ میں اس کے پاس گیا اور اسے یوں اٹھا لیا۔"

کاربٹ نے سپنگلز کو کوٹ کے کالروں سے پکڑ کر ہوا میں لٹکا دیا۔

"یوں اٹھا کر میں نے کہا۔ تو ینگ کاربٹ سے باتیں کر رہا ہے۔ اگر میں نے ایک مکّہ لگا دیا تو تیرا یہیں انتقال ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تجھ جیسے ہونّق میری دکان میں آ کر مریں۔ اسی وقت یہاں سے نکل جا اور خدا کا شکر ادا کر کہ میں نے تجھے زندہ چھوڑ دیا ہے۔"

کاربٹ نے سپنگلز کا کوٹ چھوڑا تو وہ کانپ رہا تھا۔

"رات بھر میں غم سے تلملایا۔ اور یہ واقعہ پہلی بار نہیں ہوا۔ ہر رات کوئی نہ کوئی لڑنے آ جاتا ہے۔ میں بہت ڈرتا ہوں۔ کبھی زیادہ غصّہ آ گیا تو کسی کو جان سے مار بیٹھوں گا۔ یہ کاروبار مجھ سے نہیں چلتا، یہ کام چھوڑنا پڑے گا۔"

دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ سپنگلز نے واپس جاتے وقت دیکھا کہ سپاہی خوب مزے میں ہیں۔ باجے پر مشہور دُھن 'سفید کلیاں' بج رہی تھی۔ سپاہی گا رہے تھے۔

گانا تو یونہی سا تھا لیکن لَے بُری نہیں تھی۔

سائیکل کا سفر

سپنگلز دفتر پہنچا تو ہومر لفافے بند کر رہا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا تھا۔

"مسٹر سپنگلز کیا آپ وقت پر پہنچ گئے تھے؟" ہومر نے پوچھا۔

"ہاں ایک سوانیتس پیغام لایا ہوں۔"

"ایک سوانیتس؟ آپ نے کس طرح؟؟"

"دوڑتا ہوا گیا۔"

"تو آپ نے ویسٹرن یونین کے ہرکارے کو ہرا دیا؟"

"بالکل۔ بلکہ راستے میں حسن اور معصومیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ذرا دیر رُکا بھی تھا۔"

ہومر اس فقرے کو نہ سمجھ سکا۔ سپنگلز جلدی سے بولا۔ "اپنے بھائی کو گھر چھوڑ

آؤ۔"

"مجھے گنگنہیم کے ہاں جانا ہے جو راستے میں پڑتا ہے۔ یولی سیز کو گھر اُتار کر گنگنہیم کے ہاں جاؤں گا۔ وہاں سے فولی کے ہاں اور چھ منٹوں میں واپس لوٹ آؤں گا۔"

وہ چھوٹے بھائی کو سائیکل پر بٹھا کر روانہ ہو گیا۔ قصبے سے باہر نکل کر اس نے رفتار تیز کر دی۔ یولی سیز نے پیچھے مُڑ کر بھائی کے چہرے کو دیکھا اور کُنبے کی مخصوص مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔

"بھائی جان۔"

"کیا ہے؟"

"مجھے گانا آتا ہے۔"

"اچھا؟"

یولی سیز گنگنانے لگا۔ "ہم گیت گائیں گے۔ ہم گیت گائیں گے۔"

"یہ گیت تو نہ ہوا؟ ایک فقرے کو بار بار دُہرانا گانے میں شامل نہیں۔ لو سنو میں

گاتا ہوں۔ تم ساتھ دینا۔" ہومر گانے لگا۔

"میری محبوب مت آنسو بہاتُو۔

وطن اپنا پرانا کینٹکی ہے۔

کچھ اس پیارے وطن کے گیت گاتُو۔"

"بھائی جان اسے پھر گایئے۔"

ہومر نے دوبارہ گیت سنایا اور اس مرتبہ یولی سیز بھی ساتھ گانے لگا۔ جب یولی سیز گا رہا تھا تو اسے مال گاڑی پھر نظر آئی جس میں حبشی بیٹھا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اپنی چار سالہ زندگی میں یولی سیز نے ایسا دلکش نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

گھر کے سامنے ہومر نے چھوٹے بھائی کو اُتار دیا۔ بربط اور پیانو پر گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اندر اس کی ماں، بہن اور میری ایرینا گا رہی تھیں۔

"ننھے تم جاؤ، گھر میں امّی ہیں، آپّا ہیں اور میری۔ میں کام پر جاتا ہوں۔"

"کام پر جا رہے ہیں؟"

"ہاں، رات کو لوٹوں گا۔"

چھوٹے بھائی کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر ہو مر روانہ ہو گیا۔

تین سپاہی

ڈائناسٹیڈ کے گھر میں دعوت تھی، مہمانوں میں سپنگلز بھی تھا۔ باہر بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ اس وقت بیس اور میری برساتیاں اوڑھے تار گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ بیس نے پوٹلی تھام رکھی تھی جس میں ہومر کا کھانا تھا۔ ایک نوجوان نے سیٹی بجائی اور آوازہ کسا۔

''آج کدھر دھاوا ہیں؟''

لڑکیاں خاموشی سے گزر گئیں۔ سامنے سے تین فوجی سپاہی آرہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چھٹی پر ہیں۔ آپس میں خوب دھینگامشتی کر رہے تھے یا یہ کوئی کھیل تھا جو انہوں نے زندگی کی نفاست اور اس کے مہمل پن سے تنگ آکر خود ایجاد کیا تھا۔ بارش میں وہ مسرّت کی تلاش میں تھے۔ ان کے قہقہوں سے گلی گونج رہی تھی۔ ایک دوسرے کو کھینچتے دھکیلتے آرہے تھے۔ لڑکیوں کو دیکھ کر ایک دم رُک گئے۔ ہر ایک نے باری باری سلام کیا۔ لڑکیاں خوش تو ہوئیں لیکن کچھ گھبرا

سی گئیں۔

"بیچارے گھر سے دور ہیں۔" میری نے بیس کے کان میں کہا۔ "کل وہ چھاؤنی میں ہوں گے اور ایک بیہودہ مگر اہم فرض ادا کر رہے ہوں گے۔"

"ہم رک جائیں؟" بیس نے پوچھا۔

"خواتین! ہم عظیم جمہوری فوج سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کے خادم ہیں۔ ہم تین سپاہی ہیں۔ آپ نے اپنے حسین چہرے دکھا کر جو مسرّت بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ میرے ساتھیوں سے ملئے۔ یہ ٹکساز ہے جو نیو جرزی کا رہنے والا ہے۔ یہ گھوڑا ہے، اس کا گھر ٹکساز میں ہے۔ میں موٹا ہوں مگر بھوکی سر زمین سے آیا ہوں۔ میں حسین امریکن لڑکیوں کی رفاقت کا بھوکا ہوں۔"

"ہم سینما جا رہی ہیں۔"

"کیا ہم تین سپاہی جو آج یہاں ہیں اور کل خُدا جانے کہاں ہوں گے، دو امریکن لڑکیوں کے ساتھ سینما جا سکتے ہیں؟ آج آج ہے اور کل۔ کل ہی ہے۔ انسانی دماغ میں آزادی کو تباہ کرنے والے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں جھلس دینے کا مقدس فرض ہمارے سپرد ہے۔ آج ہم اپنے گھروں سے دور ہیں، تنہا ہیں۔ آج ہم آپ کے بھائی ہیں۔ شکاگو کی گلیوں سے پکڑ کر مجھے اس فوجی وردی میں

اتار دیا گیا ہے۔ آپ کی رفاقت مجھے اپنے شہر میں لے جائے گی۔ ہمارے التماس پر فیاضی کا مظاہرہ کیجئے۔ ہم سب ایک بڑے کُنبے کے افراد ہیں۔ ہم انسان ہیں۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو ہمیں آپ سے ملنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ ایسے موقعے صدیوں میں کبھی کبھار آتے ہیں۔"

"یہ تو بالکل پاگل ہے۔" میری نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں بیچارہ اداس ہے۔ تو ان کے ساتھ سینما دیکھ آئیں۔"

"اچھا تو تم ہی اس سے کہہ دو کہ مجھ سے تو بات نہیں کی جائے گی۔"

"چلئے۔" بیس نے سپاہیوں سے کہا۔

"ہم ممنون ہیں، شکر گزار ہیں، احسان مند ہیں۔" موٹے نے کہا۔

"پہلے میں اپنے بھائی کو کھانا پہنچادوں۔ وہ قریب ہی تار گھر میں ہو گا۔"

"تار گھر؟" موٹا بولا۔ "چلو یارو تار بھیجتے ہیں۔ کیوں ٹیکساز؟"

"نیو جرزی کا پتہ نہیں کیا لگے گا؟"

"ایک ذرا سے تار پر کون سی دولت خرچ ہو جائے گی۔ اور تم گھوڑے؟"

"میں امّی، جو اور کٹی کو تار بھیجوں گا۔ کٹی میری محبوبہ ہے۔"

"دنیا کی ہر لڑکی میری محبوبہ ہے۔ اتنے سارے تار کیسے بھیجوں۔ لہٰذا ایک تار ہی سب کے لیے کافی ہو گا۔" موٹے نے فیصلہ کیا۔

پانچوں تار گھر پہنچے۔ وہاں گروگن اکیلا بیٹھا تھا۔

"میں ہومر کی بہن ہوں اس کا کھانا لائی ہوں۔"

"آپ اچھی تو ہیں مس میکالے؟ ہومر ابھی آ جائے گا۔ میں اسے بتا دوں گا۔"

"یہ تینوں سپاہی تار بھیجنا چاہتے ہیں۔"

"ضرورت۔ یہ لیجئے پنسل اور خالی فارم۔" گروگن بولا۔

"جرزی شہر کا کیا لگے گا؟" ٹیکساز نے پوچھا۔

"پچیس الفاظ کے پچاس سینٹ ہوں گے۔ پتے اور دستخط کے الفاظ نہیں گنے جائیں گے۔ تار علی الصبح پہنچ جائے گا۔"

"اور سان انتون کا کیا ہوا؟" گھوڑا بولا۔

"جرزی سے نصف۔ سان انتون مقابلۃً قریب ہے۔"

موٹے نے تار لکھ کر دیا۔ گروگن الفاظ گننے لگا۔

"ایماڈانا۔ معرفت شکاگو یونیورسٹی، شکاگو؟"

"جانم مجھے تم سے محبّت ہے۔ میں تمہیں یاد کرتا ہوں۔ ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے۔ خط لکھتی رہا کرو۔ سویٹر مل گیا شکریہ۔ اصل اقتصادیات تو میں ان دنوں سیکھ رہا ہوں۔ ہم بہت جلد محاذ پر جا رہے ہیں۔ اتوار کو گرجے میں میرے لیے دُعا ضرور مانگا کرو۔ باقی سب خیریت ہے۔

نارمن"

ٹیکساز نے اپنا فارم گروگن کو دیا:

"مسز ایڈ تھ انتھنی۔ ول منگٹن سٹریٹ جرزی شہر۔ نیو جرزی۔

امّی جان! کیسی ہیں؟ میں خیریت سے ہوں۔ آپ کا خط اور خشک انجیر ملے۔ شکریہ۔ کسی بات کا فکر مت کیجئے۔ خدا حافظ۔

برنارڈ"

گھوڑے کا تار یوں تھا:

"مسز ہاروے گلفورڈ۔ سفنڈی فورڈ بولیوارڈ۔ سان انتونیو۔ ٹکیساز۔

چمکیلے کیلیفورنیا کے قصبے اتھیکا سے آداب عرض کرتا ہوں۔ اگرچہ اس وقت یہاں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ہا۔ہاہا۔ سب کو سلام پہنچا دیجئے۔ جو سے کہئے کہ وہ میری بندوق اور کارتوس بے شک لے لے۔ خط ضرور لکھئے۔

کونٹن"

گروگن مشین کے پاس جا بیٹھا۔ سپاہی اور لڑکیاں سینما چلے گئے۔

اس وقت پردے پر ونسٹن چرچل کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ۱۹۴۲ء میں کینیڈا کی پارلیمنٹ میں تقریر کر رہے تھے۔ سپاہیوں اور لڑکیوں کو بیٹھنے میں کچھ وقت لگا۔ اتنے میں چرچل کچھ ایسی باتیں کہہ چکے تھے جس پر پارلیمنٹ کے ممبر بھی تالیاں بجا رہے تھے اور سینما میں تماشائی بھی۔

موٹے نے بیس سے کہا۔ "یہ شخص دنیا کے عظیم ترین آدمیوں میں سے ہے۔ یہ ایک عظیم امریکن بھی ہے۔"

"میں نے سُنا تھا کہ چرچل انگریز ہے۔" گھوڑا بولا۔

"درست ہے مگر یہ امریکن بھی ہے۔ دنیا میں جو اچھا انسان بستا ہے۔ آج سے وہ

امریکن ہی کہلائے گا۔" موٹے نے کہا اور میری کی طرف جھک گیا۔ "آپ نے ہمیں رفاقت بخشی ہے۔ ہم ممنون ہیں۔ لڑکیاں ساتھ ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اچھی اچھی خوشبوئیں بھی آتی ہیں جو سپاہیوں سے ہرگز نہیں آتیں۔"

"ہم تو ویسے بھی سینما آرہے تھے۔" میری بولی۔

اب پردے پر مسٹر روزویلٹ اپنے ہائیڈ پارک والے گھر سے تقریر کر رہے تھے۔ تقریر ان کی مخصوص متانت اور خوش طبعی کی حامل تھی۔ سب خاموشی سے سنتے رہے۔ تقریر ختم ہوئی تو تالیاں بجیں۔

"یہ امریکہ کا سب سے بڑا سپوت ہے۔" گھوڑے نے کہا۔

پردے پر امریکہ کا جھنڈا لہرایا تو دوبارہ تالیاں بجیں۔

"اور یہ دنیا کا ممتاز ترین جھنڈا ہے۔" ٹیکساز بولا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ ملک کی قدر تبھی ہوتی ہے جب کوئی مصیبت آجائے۔ ورنہ انسان وطن کی پروا نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے کُنبے کو کوئی کچھ نہیں سمجھتا۔" موٹے نے کہا۔

"اس جھنڈے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پہلے یہ نظر آتا تو

مجھے واشنگٹن اور لنکن کا خیال آیا کرتا اور اب اپنا پردیسی بھائی مارکس یاد آنے لگتا ہے۔" بیس بولی۔

"اچھا تمہارا بھائی فوج میں ہے؟"

"ہاں۔ کچھ عرصہ ہوا شمالی کیرولینا سے اس کا خط آیا تھا۔"

"جھنڈا دیکھ کر ہمیں اپنی عزیز ترین چیزیں یاد آتی ہیں۔ میری نگاہوں میں شکاگو پھرنے لگتا ہے، اپنی اچھی اور بُری چیزوں سمیت۔ اچھی چیزوں سے مراد میری محبوبہ اور عزیز و اقارب ہیں اور بُری چیزیں وہاں کی سیاست اور غلیظ گلی اور کوچے ہیں۔ لیکن مجھے ان سب سے محبت ہے۔ ایک دن وہ گلیاں دوبارہ تعمیر ہوں گی اور سیاست بھی سدھر جائے گی۔" موٹے نے کہا۔

"ہمارے قصبے میں تو گلی کوچے ایسے نہیں ہیں۔ البتہ غربت ہے۔ سیاست کا بھی زور نہیں ہے۔ ویسے ہمارے کُنبے کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں تو موسیقی پسند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت میرا بھائی مارکس گا رہا ہو گا یا آرگن بجا رہا ہو گا۔"

اس وقت مارکس شمالی کیرولینا کے ایک چھوٹے سے قصبے کے میخانے میں آرگن بجا رہا تھا۔ اس کا رفیق ٹوبی جارج گا رہا تھا۔ ٹوبی جارج اپنے دوست مارکس کے

پاس جا بیٹھا اور میکالے کُنبے کے متعلق پوچھنے لگا۔

اسی وقت سپنگلز اور ڈائنا سینما میں داخل ہوئے۔ فلم ابھی شروع ہوئی تھی۔ پردے پر اداکاروں کی فہرست آئی۔ پھر کچھ اور نام آئے۔ چند لوگوں کی تعریف بھی کی گئی تھی۔ ساتھ ساتھ ایک دُھن بج رہی تھی۔ ان دونوں کو پردے کے سامنے جگہ ملی۔ آس پاس کی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ کونے میں چند بچّے بیٹھے تھے۔

بیس، میری اور ان کے ساتھی کافی پیچھے بیٹھے تھے۔ ہسپتال کا سین دکھایا جا رہا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری اور شفاف۔ چمکتا ہوا فرش اور مکمل خاموشی۔

یکایک ہال میں آواز گونجی۔ ڈاکٹر کیوانا۔ ڈاکٹر کیوانا۔ آپ کی ضرورت ہے۔

یہ سنتے ہی سپنگلز اُٹھ کھڑا ہوا۔ شام بہت اچھی گزری تھی۔ پینے پلانے کا شغل بھی رہا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے قطار میں بیٹھے ہوئے بچّوں کا ہم عمر ہو۔

”افوہ۔ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ آؤ۔“ اس نے ڈائنا کو گھسیٹا۔

”لیکن فلم تو ابھی ختم نہیں ہوئی۔“

”میرے لیے ختم ہو چکی ہے۔ آؤ“

باہر نکلتے ہوئے سپنگلز نے ایک بچّے سے کہا۔ ”تم بہشت میں ضرور جاؤ گے۔ ڈائنا بچّے کے سامنے مت آؤ اسے فلم دیکھنے دو۔“

”لیکن فلم تو ابھی شروع ہی ہوئی ہے۔“ وہ حیران تھی۔

”جی آپ نے کیا فرمایا تھا؟“ بچّے نے پوچھا۔

”یہی کہ تم بہت اچھے بچّے ہو سیدھے بہشت میں جاؤ گے۔“

بچّے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے حیرت سے سپنگلز کو دیکھا اور پوچھا۔

”جی کیا بجا ہے؟“

”پتا نہیں۔ لیکن زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ سپنگلز نے کہا۔

دونوں باہر کھڑے تھے۔ ”ذرا کاربٹ کے ہاں چلتے ہیں۔ تھوڑی سی پی کر پیانو سنیں گے۔ پھر تم گھر چلی جانا۔“

”تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ہے نا؟ بتاؤ۔“

”محبت؟ میں تمہیں فلم دکھانے جو لے گیا تھا۔“

بارش ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے کاربٹ کی دکان کی طرف جا رہے تھے۔

مسٹر گروگن اور جنگ

جب سپنگلز اور ڈائنا کاربٹ کی دکان میں داخل ہوئے اس وقت بارش میں بھیگا ہوا ہومر تار گھر پہنچا۔ وہاں فقط ایک تار پڑا تھا۔

”نہیں تمہارا کھانا چھوڑ گئی ہے۔“ گروگن بولا۔

”ناحق لے آئی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ سموسے کھاؤں گا۔ کئی چیزیں آئی ہیں مسٹر گروگن!

آپ بھی تھوڑا سا کھا لیجئے۔“

”میرا جی نہیں چاہ رہا۔“

”تھوڑا سا چکھیں گے تو شاید بھوک لگ آئے۔“

”نہیں برخوردار۔ اور تم تو بالکل شرابور ہو رہے ہو۔ یہاں برساتیاں پڑی تھیں۔ اوڑھ جاتے۔“

"میں راستے میں تھا کہ بارش آگئی۔ چند لقمے کھا کر میں یہ تار دے آؤں گا۔ کیسا تار ہے یہ؟"

گروگن چپ رہا۔ ہومر سمجھ گیا کہ ضرور کسی کے مرنے کی خبر ہو گی۔

"کاش کہ ایسے تار یہاں نہ آیا کریں۔" ہومر نے کھانا چھوڑ دیا۔

"جی بُرا مت کرو۔ کھانا کھا لو۔ آج تمہاری بہن کے ساتھ ایک حسین لڑکی تھی۔"

"جی ہاں۔ وہ میری ہے۔ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ میرے بھائی مارکس کی منگیتر۔ جنگ ختم ہوتے ہی دونوں کی شادی ہو جائے گی۔"

"ان کے ساتھ تین سپاہی بھی تار دینے آئے تھے۔"

"اچھا؟ کہاں ہیں تار؟"

ہومر تار پڑھنے لگا۔ مسٹر گروگن میں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ جنگ میں جو ہمارے دوست آشنا اور ناواقف مرتے رہتے ہیں ان کی موت کس قدر بے سود ہے۔ اتھیکا چھوٹا سا گاؤں ہے۔ امریکہ میں ایسے بے شمار قصبے ہیں۔ وہاں بھی ایسے تار آتے ہوں گے۔ امیروں کے نام۔ غریبوں کے نام۔ سب کے نام۔

جنگ میں لوگ کس لیے مرتے ہیں؟ کچھ تو مقصد ہو گا؟"

بوڑھا خاموش ہو گیا جیسے مزید گفتگو کے لیے اسے کسی سہارے کی ضرورت ہو۔ اس نے میز کی دراز سے بوتل نکالی۔ بڑے بڑے گھونٹ لیے اور ہومر کے سامنے بیٹھ گیا۔

"مجھے اس دنیا میں آئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ شاید ضرورت سے زیادہ طویل عرصہ ہو گیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جنگ ہو یا امن دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، بلا مقصد کبھی نہیں ہوا اور پھر موت تو نہایت اہم سانحہ ہے۔"

بوڑھے نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ نسلِ انسانی کے سب افراد ایک دوسرے جیسے ہیں۔ تم انسان ہو، تم میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ اسی طرح ہر انسان کے خمیر میں نیکی بھی ہے اور بدی بھی۔ جیسے ضمیر میں متضاد جذبات کی جنگ ہوتی ہے۔ اسی طرح کائنات میں مختلف قوتیں آپس میں لڑتی ہیں۔ جسم بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ جنگیں ظہور میں آتی ہیں۔ لیکن ہر دفعہ فتح نیکی کی ہوتی ہے۔ بیمار روح اور جسم شفا پاتے ہیں۔ یہ عارضے دوبارہ لاحق ہوتے ہیں لیکن تندرستی پھر عود کر آتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جسم و روح کو ایک نئی جلا ملتی ہے۔ پہلے سے کہیں برتر، نستعلیق اور قوی۔ پھر ان پر کسی تباہی یا

افسردگی کا اثر نہیں ہوتا۔ ہم سب کسی مقصد کے لیے کوشاں ہیں۔ مقصد اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ یوں تو چور اور خونی بھی کسی مقصد ہی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔"

بوڑھے نے لمبا سانس لیا۔ "اس کشمکش میں انسان جان دیتا ہے۔ اس کی موت بے سود نہیں ہوتی۔ یہ سچائی کی تلاش میں تھا۔ حسن، پاکیزگی۔ حیاتِ جاودانی کی تلاش میں تھا۔ کسی نہ کسی دن نسلِ انسانی اپنی منزل پالے گی۔ جہاں انصاف ہو گا۔"

بوڑھے نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔

"ایک کام کرو۔ جلدی سے یہ دوا لے آؤ۔"

ہومر کاغذ لے کر بھاگا۔ بوڑھا کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر کرسی پر گر پڑا۔ اور ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اسے دل کا دورہ پڑ رہا تھا۔

ہومر دوا لے آیا۔ بوڑھے نے پانی مانگا اور تینوں گولیاں نگل لیں۔

"میں از حد ممنون ہوں۔" اس نے لڑکے سے کہا۔

ہومر نے دیکھا کہ اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ اس نے لفافے سے تار نکال کر

پڑھا۔ اسے نئے لفافے میں بند کر کے باہر نکل گیا۔

بوڑھا پیچھے پیچھے آیا اور دروازے سے ہومر کو دیکھنے لگا جو بارش اور آندھی میں تیزی سے جا رہا تھا۔

تار کی مشین کھڑکنے لگی، لیکن بوڑھے نے آواز نہیں سُنی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔

امّی کے لیے

ہومر نے سائیکل پرانی واضع کے بڑے مکان کے سامنے روکی۔ اندر پارٹی ہو رہی تھی۔ بڑا شور مچا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ چار پانچ جوڑے ناچ رہے تھے۔ دہشت سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ کچھ دیر موسیقی سنتا رہا۔ کئی بار اس کا ہاتھ گھنٹی کے بٹن تک پہنچا لیکن واپس آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تار گھر واپس جا کر استعفا دے دے۔ لعنت ہے ایسی نوکری پر!

آخر ہمّت کر کے اس نے بٹن دبا دیا۔ ایک نو عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھتے ہی وہ سائیکل کی طرف بھاگا۔

"کیا بات ہے لڑکے؟" عورت نے پیار سے پوچھا۔

ہومر واپس آ گیا۔ "معاف کیجیے۔ میں مسز کلاڈیا بیو فریر کے نام تار لایا ہوں۔"

"آج امّی کی سالگرہ ہے۔" وہ اندر چلی گئی۔ "امّی آپ کا تار آیا ہے۔"

اس کی ماں بھی آگئی۔ "یقیناً یہ ایلن کا تار ہے۔ لڑکے اندر چلے آؤ۔ آؤ تھوڑا سا کیک تو کھاؤ گے نا؟"

"جی نہیں۔ مجھے کام پر ابھی پہنچنا ہے۔"

بوڑھی عورت نے لفافہ اس طرح لیا جیسے اس میں سالگرہ کی مبارکباد ہو۔

"نہیں نہیں، تمہیں یوں نہیں جانے دیں گے۔ ذرا سا کیک چکھ لو" بوڑھی نے مسرور لہجے میں کہا اور ہومر کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ بڑی میز پر طرح طرح کی نعمتیں رکھی ہوئی تھیں۔ وسط میں سالگرہ کا کیک تھا۔

"آج میری سالگرہ ہے۔ خدایا وقت کتنی جلدی گزرتا ہے۔ میں سچ مچ بوڑھی ہو گئی ہوں۔ بیٹے مجھے مبارکباد نہ دو گے؟"

"آپ کا سالگرہ۔ آپ کو سالگرہ۔" ہومر کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وہ سرپٹ دروازے کی طرف بھاگا۔

بوڑھی نے اِدھر اُدھر جھانکا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ ایک کونے میں جا کر لفافہ کھولا۔ دیوار پر اس کے سرخ بالوں والے خوبصورت لڑکے کی تصویر لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا:

"امّی کے لیے"

"میری بارہویں سالگرہ پر۔"

بوڑھی نے تار پڑھا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی جو گراموفون کے نغمے میں ڈوب گئیں۔ لوگ ناچ رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔

لڑکی نے دور سے ماں کو دیکھا اور جلدی سے گراموفون بند کر دیا۔

"امّی!" اس نے چیخ ماری اور ماں کی طرف بھاگی۔

اپنا اپنا دکھ

فلم ختم ہو چکی تھی۔ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ بیس نے موٹے سے کہا۔

”اب ہم گھر جائیں گی۔“

”ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔“

تینوں سپاہی خاموش کھڑے کسی خوشگوار غیر متوقع واقعے کے منتظر تھے۔ موٹا لڑکیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے بڑی معصومیت سے بیس اور میری کو چوم لیا۔

”اور ہم؟“ گھوڑے نے احتجاج کیا۔ ”میں اور ٹیکساز بھی تو فوج میں ہیں؟“

گھوڑے نے انہیں چوما اس کے بعد ٹیکساز نے۔

ایک عورت چلتے چلتے رُک گئی اور یہ نظارہ دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے لگی۔

لڑکیاں جلدی سے گلی میں غائب ہو گئیں۔

گھوڑے نے چھلانگ لگائی اور ٹیکساز پر سوار ہو گیا۔ اس نے موٹے کو دھکیلا۔ تینوں اچھلتے کودتے چلاتے روانہ ہو گئے۔

"یودھوو۔ ٹیکساز" گھوڑا چلایا۔

"موٹے کی زبان کیسی چلتی ہے۔ کیوں بے شکاگو یونیورسٹی کے موٹے تازے سینیٹر۔" ٹیکساز نے نعرہ لگایا۔

موٹا زور سے ہنسا۔ "یار وجب کانگریس میں منتخب ہو کر پہنچوں گا تو حکومت سے کئی شکایتیں کروں گا۔"

"ہپی یے یے۔ چلے چلو میاں، کیا ہانک رہے ہو۔ اپنا اپنا دکھ ہے، اکیلے جھیلو۔"

مینڈک مینڈک کھیلتے، ایک دوسرے کو پھلانگتے، روشن گلیاں چھوڑ کر وہ اندھیرے کی طرف جا رہے تھے۔

جنگ کی طرف۔

ایک بہتر زندگی

ہومر تار دے کو واپس آیا تو بارش تھم چکی تھی۔ چاند چمک رہا تھا اور اُجلے اُجلے بادلوں کے ٹکڑے کھلے آسمان پر تیر رہے تھے۔

"ٹانگ کو کیا ہوا، دن بھر لنگڑاتے رہے ہو۔" گروگن بولا۔

"جی ٹھیک ہوں۔ کوئی اور تار تو نہیں آیا؟"

"اب چھٹی ہے۔ گھر جا کر مزے سے سو جاؤ۔ تمہاری ٹانگ کو ضرور کچھ ہوا ہے۔"

"موچ آ گئی ہے۔ سکول میں دوڑ تھی۔ میں سب سے آگے تھا۔ اتنے میں ڈرل ماسٹر جو مجھے پسند نہیں کرتا، سامنے سے آ گیا۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں رُکا نہیں۔ وہیں ٹھہر جاتا تو اچھا تھا۔ یونہی جیتنے کی دُھن میں دوڑتا چلا گیا۔ ہم دونوں دھڑام سے گرے۔ عجیب بات ہے کہ میرے ہم جماعت ہیوبرٹ ایکلے نے لڑکوں کو وہیں روک لیا۔ یہ لڑکا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ امیر گھرانے کا ہے اور تصنّع کا

عادی ہے۔ جس لڑکی کو میں چاہتا ہوں وہ اسے پسند کرتی ہے۔ جتنی زیادہ وہ اس کی جانب ملتفت ہوتی ہے اتنی ہی مجھے آگ لگتی ہے۔ رشتے داروں کو چھوڑ کر یہ لڑکی مجھے سب سے عزیز ہے اور یہی میری پروا نہیں کرتی۔ وہ جو ڈرل ماسٹر ہے بائی فیلڈ اسے مخل ہونے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بڑا شیطان ہے۔ مس ہکس نے بتایا کہ وہ جھوٹا بھی ہے۔ مس ہکس ہماری اُستانی ہیں اور پینتیس سال سے تاریخ پڑھا رہی ہیں۔ انہوں نے بھائی مارکس اور آپا بیس کو بھی پڑھایا ہے۔ تو ڈرل ماسٹر سے ٹکر کھا کر میں گرا اور چوٹ لگ گئی۔ لیکن اٹھتے ہی پھر بھاگنے لگا۔ میں اس لیے جیتنا نہیں چاہتا تھا کہ واہ واہ ہو گی یا ہیوبرٹ کو ہرادوں گا کیونکہ ہیوبرٹ نے تو میرے گرنے پر لڑکوں کو روک لیا تھا۔ میں تو اس لیے کوشش کر رہا تھا کہ مسٹر سپنگلز نے سکول میں یہ دوڑ جیتی تھی اور اُستانی صاحبہ بھی چاہتی تھیں کہ میں جیت جاؤں۔ ہوا یوں کہ جماعت میں میری اور ہیوبرٹ کی بحث چھڑ گئی۔ اُستانی صاحبہ نے سزا کے طور پر ہمیں وہیں بٹھا لیا۔ بائی فیلڈ آیا اور جھوٹ بول کر ہیوبرٹ کو ساتھ لے گیا۔ اُستانی کہتی ہیں کہ جب وہ ان کا طالب علم تھا تب بھی جھوٹ بولا کرتا تھا۔ وہ ملول ہو گئیں اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ اور مجھے دوڑنے کی اجازت بھی دے دی۔ مسٹر سپنگلز تو علاقے کے چمپین رہ چکے ہیں۔ دیکھئے میں کیا کرتا ہوں۔ اس سال تو مشکل ہے۔ اگلے سال شاید۔“

ہومر نے ٹانگ کو دو تین جھٹکے دیئے۔ ''اس پر کسی چیز کی مالش کروں گا۔"

''سائیکل چلانے میں تو دقّت نہیں ہوتی؟"

''ہوتی تو ہے لیکن داہنے پاؤں سے پیڈل گھماتا ہوں۔ بائیں ٹانگ پر زور نہیں پڑتا۔"

''معمولی سی موچ معلوم ہوتی ہے۔ مالش سے ٹھیک ہو جائے گی۔"

''ہومر صرف تین دن میں تم کتنے بدل گئے ہو؟"

''جی بدل تو گیا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے عمر میں بڑا ہو گیا ہوں۔ نوکری سے پہلے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ جو تھوڑی بہت معلومات تھیں وہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سب کہتے کہ میں سکول کا سب سے ہوشیار لڑکا ہوں۔ یہاں تک کہ جو مجھے پسند نہیں کرتے وہ بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں آتا، سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

''ہاں کوشش جاری رکھنی چاہیے۔"

''مسٹر گروگن پتا نہیں مجھے کہنا چاہیے یا نہیں، مگر وہ نہیں جو نظر آتا ہوں۔ باطن میں مَیں اس سے کہیں بہتر ہوں۔"

وہ بولتا چلا گیا۔ شاید اس لیے کہ تھکا ہوا تھا۔ موچ سے پریشان تھا ایک مسرور کُنبے کو موت کی خبر پہنچا کر آیا تھا اور اسے یقین تھا کہ گروگن بھلا آدمی ہے۔

”میرا جی بہت چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک نئی دنیا تخلیق ہو۔ ایک بہتر زندگی جنم لے۔ ایک نئی نسل ظہور میں آئے۔ یہ باتیں میں کسی اور سے بھی نہ کرتا۔ مسٹر گروگن۔ میں دن رات محنت کروں گا۔ کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ پہلے میں ہوائی قلعے بنا بنا کر خوش ہو لیا کرتا تھا۔ ہمارا کنبہ خوش باش انسانوں کا کنبہ ہے اور ہمیشہ مسرور رہتے ہیں۔ لیکن اب پتا چلا ہے کہ میں بالکل لاعلم تھا۔ اب تک میں نے یہ سیکھا ہے کہ کچھ بھی نہیں سیکھا۔ لیکن اب میں آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں۔ اگرچہ اس طرح احساسِ تنہائی بڑھ جاتا ہے۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ ہمارے کُنبے میں سب خوش رہتے ہیں۔ لیکن ہم میں سختی اور توانائی بھی ہے۔ مجھے اب بیچاروں پر ترس آتا ہے جو مغموم و تنہا ہیں اور ان میں سختی اور برداشت بھی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ اب تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں رہی کہ ہیلن مجھے پسند کرتی۔ کاش کہ یوں ہوتا کہ وہ مجھے پسند کرتی لیکن ایسا نہیں ہے۔ تب بھی ٹھیک ہے۔ اسے ہیروبرٹ عزیز ہے تو یونہی سہی۔ ہیلن جیسی نفاست پسند لڑکی کو اگر ہیوبرٹ سا تصنّع پسند بھا گیا تو کوئی تعجّب کی بات نہیں۔ میں آدابِ محفل سے بے بہرہ ہوں۔ جو دل میں ٹھان لوں، کر

گزرتا ہوں۔ بعض اوقات کلاس میں اُلٹی سیدھی ہانک دیتا ہوں۔ اُستادوں کو پریشان کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس لیے کہ کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی میں کیسے کیسے غم ہیں، کتنی پیچیدگیاں ہیں۔ یا تو کچھ ہوا ہی نہیں، اگر ہوتا ہے تو غلط ہوتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی واہی تباہی بَک لینے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یونہی خواہ مخواہ شستہ بن کر دکھاؤں۔ تصنّع سے مجھے نفرت ہے۔"

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا "افوہ بارہ بج چکے ہیں۔ کل سنیچر ہے۔ سنیچر کا پہلے کتنا چاؤ ہوتا تھا۔ مسٹر گروگن ایک سینڈوچ کھالیجئے۔"

"دے دو برخوردار، اب بھوک لگ آئی ہے۔" گروگن کھانے لگا۔

"اپنی والدہ کا شکریہ ادا کردینا۔"

"جی نہیں، معمولی سی بات ہے۔"

"نہیں معمولی نہیں ہے، میں ان کا ممنون ہوں۔"

"بہت اچھا میں کہہ دوں گا۔"

طلوعِ نور

گروگن دفتر میں بیٹھا ایک دُھن گنگنا رہا تھا جس سے اس کی جوانی کی یادیں وابستہ تھیں۔ سپنگلز آ گیا۔ کچھ خمار، کچھ ڈائنا کے ساتھ گزاری ہوئی دلکش شام کا اثر، بہت خوش تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن بات نہ کی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ کبھی کبھی گھنٹے گزر جاتے اور دونوں خاموش بیٹھے رہتے۔ سپنگلز نے کاغذات کے ڈھیر پر رکھا ہوا انڈا اٹھایا اور کچھ سوچ کر واپس رکھ دیا۔ ڈائنا یاد آ گئی۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ہے نا؟" اس نے دوہرایا۔

"کیا ہے ٹام؟"

"ولی اگر تم سے کوئی حسینہ کہے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ہے نا؟ تو تم کیا سمجھو گے؟"

"کہہ نہیں سکتا۔"

”ایسی حسینہ تمہیں کیسی لگے گی ولی۔ جو بار بار یہ کہے۔ تمہیں مجھ سے محبّت ہے۔ ہے نا۔“

بوڑھا مسکرانے لگا۔

”کوئی نئی بات؟“ سپنگلز نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔ سوائے اس کے کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔“

”نیا لڑکا کیسا ہے؟“

”سب ہرکاروں سے اچھا۔“

”میں نے تو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکا اچھا ہے۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ہے نا؟“ سپنگلز کو رہ رہ کر وہی الفاظ یاد آ رہے تھے۔

”ولی۔ دفتر میں خود بند کر لوں گا۔ مجھے تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ اس ہرکارے کا نام خوب ہے۔ ہومر میکالے۔ اس کا باپ ہومر کی جگہ تھامس، ولیم، ہنری، یا کوئی اور معمولی سا نام بھی رکھ سکتا تھا۔“

”اس کے چھوٹے بھائی کا نام 'یولی سیز' ہے اور بہن کا بیس۔“

"ہومر، یولی سیز، ہیس۔"

"اور بڑا بھائی مارکس۔"

"مارکس، ہیس، ہومر، یولی سیز۔ سب تاریخی نام ہیں۔" سپنگلز بولا۔

"تم گھر جانا چاہو تو چلے جاؤ۔"

"گھر؟" گروگن مُسکرایا۔ "دفتر کے بعد مجھے کوئی کام نہیں ہوتا۔ سوائے سونے کے اور نیند سے مجھے نفرت ہے۔ تھوڑی دیر اور دفتر میں ٹھہر جاؤں؟"

"ولی تم فکر بہت کرتے ہو۔" سپنگلز نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ "زیادہ سوچا مت کرو۔ نہ تم بوڑھے ہو، نہ تمہیں کوئی پنشن پر بھیج سکتا ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ تم ایک دن نہ آؤ تو دفتر نہیں چل سکتا۔ تم سو برس کی عمر پاؤ گے تو بھی تمہارا ہر روز کام میں گزرے گا۔"

"شکریہ شام آج پھر دل کا دورہ پڑا تھا۔ یونہی معمولی سا تھا۔ مجھے کچھ دیر پہلے پتا چل گیا۔ لڑکا یہیں تھا۔ دوڑ کر دوا لے آیا۔ ڈاکٹروں نے دوائی منع کر رکھی ہے۔ کہتے ہیں آرام کرو اور طبّی معائنہ کراتے رہا کرو۔"

"ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے۔ وہ صرف مادے کو سمجھتے ہیں، روح سے ناآشنا ہیں۔"

"اور میں اور تم غیر مادی دنیا میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی باتوں کا خیال مت کیا کرو۔ ویسے کبھی کبھی آرام کر لیا کرو۔"

"ٹام۔ اب تو دائمی آرام قریب ہے۔"

"میرے خیال میں تم کاربٹ کے ہاں جا کر کچھ پیو۔ وہاں موسیقی بھی ہے۔ اس کے بعد ہم زمانے کی باتیں کریں گے۔ ولنسکی، ٹاملنسن، ڈیون ہیری بل اور بکللے میکن ٹائر کی باتیں۔ جا کر ایک دو جام پی آؤ۔"

"مجھے شراب نہیں پینی چاہیے ٹام۔"

"مجھے معلوم ہے کہ نہیں پینی چاہیے۔ لیکن شراب تمہیں پسند ہے۔ کبھی کبھی پسند ممانعت سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ جاؤ پی آؤ۔"

"اچھا۔"

گروگن کے جاتے ہی ایک نوجوان جو دیر سے باہر چکر لگا رہا تھا اندر آ گیا۔ سپنگلز نے اسے پہچان لیا۔

"تمہاری ماں نے فوراً منی آرڈر بھیج دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم گھر چلے گئے ہو گے۔ شاید رقم واپس کرنے آئے ہو۔ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"

”میں لوٹانے نہیں بلکہ مزید رقم لینے آیا ہوں اور اس مرتبہ مانگوں گا نہیں، وصول کروں گا۔“

”معاملہ کیا ہے؟“سپنگلز نے پوچھا

”یہ ہے!“ نوجوان نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ اس کی انگلیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ سپنگلز مسرور تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

”جلدی سے نقدی میرے حوالے کر دو! جو کچھ دفتر میں ہے نکالو۔ ہر جگہ لوگ ایک دوسرے کی جان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں مار دیا، یا میں مارا گیا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر شور مچایا، رقم دینے میں حجّت کی تو گولی مار دوں گا۔ جلدی کرو۔“

سپنگلز نے نقدی کا صندوق کھولا۔ سارے نوٹ اور سِکّے نکال کر نوجوان کے سامنے رکھ دیئے۔

”یہ تو میں تمہیں ویسے بھی دے دیتا۔ اس لیے نہیں کہ تم ہتھیار اٹھائے کھڑے ہو بلکہ اس لیے کہ ضرورت مند ہو۔ اس وقت صرف اتنی ہی نقدی ہے۔ اسے لے کر پہلی ٹرین سے گھر چلے جاؤ۔ تقریباً پچھتر ڈالر ہیں۔ یہ میں اپنی تنخواہ میں سے ادا کر دوں گا۔“

نوجوان خاموش کھڑا تھا۔

”کہہ تو رہا ہوں لے لو۔ تمہیں ضرورت ہے۔ تم مجرم معلوم نہیں ہوتے اور نہ تمہاری علالت لا علاج لگتی ہے۔ تمہاری والدہ انتظار کر رہی ہوں گی۔ یہ رقم میں انہیں تحفتاً پیش کرتا ہوں۔ یہ چوری میں شمار نہیں ہو گا۔ اور یہ ریوالور نیچا کر لو بلکہ اسے پھینک دو۔“

نوجوان نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور اسی ہاتھ سے منہ چھپا لیا۔ پھر بولا۔

”اب مجھے اسی ریوالور سے خودکشی کر لینی چاہیے۔“

”بے وقوف مت بنو! نوٹ اور سِکّے لو اور گھر چلے جاؤ۔ اگر چاہو تو ریوالور یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ بارہا ایسے خیالات میرے دل میں بھی آئے ہیں۔ سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ قبرستان اور جیل ان امریکی لڑکوں سے بھرے ہوئے ہیں جنہیں بدنصیبی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ عادی مجرم ہرگز نہ تھے۔“

نوجوان نے ریوالور سپنگلز کے سامنے ڈال دیا اور بولا۔ ”میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن جس طرح پیش آئے ہو آج تک کوئی اس طرح پیش نہیں آیا۔ نہ مجھے ریوالور چاہیے نہ رقم۔ سیدھا گھر جاؤں گا۔ میں ہیرا پھیری کر کے یہاں آیا تھا۔

اسی طرح واپس چلا جاؤں گا۔" وہ کھانسنے لگا۔ "پتا نہیں ماں بے چاری نے تیس ڈالر کس طرح اکٹھے کیے ہوں گے۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے اور میں نے وہ سب شراب اور جوئے میں ضائع کر دیئے۔"

اندر چلے آؤ۔" سپنگلز نے اسے بلایا۔ وہ آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بات کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں بیمار ہوں۔ شاید مجھے دق ہے۔ اگر نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔ میں شکایت نہیں کر رہا لیکن بد قسمتی سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی ہے۔ ویسے سارا قصور میرا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی مت جاؤ۔ میں سب کچھ سننا چاہتا ہوں۔"

"کیا بتاؤں! مجھے سمجھ بوجھ سے قاصر سمجھئے۔ میں نہیں جانتا کہ میری منزل کہاں ہے اور اگر وہاں پہنچ گیا تو کیا کروں گا۔ میرا کوئی عقیدہ نہیں، کوئی ایمان نہیں۔ حالانکہ میرے والد پادری تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں تین برس کا تھا۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ وقت کیسے گزاریں؟"

"وقت تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے۔ کسی مفید کام میں گزرے تو بات

ہے۔"سپنگلز بولا۔

"میں سدا کا بے چین اور غیر مطمئن ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔ ہر چیز اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ مجھے لوگوں سے نفرت ہے۔ نہ ان پر بھروسہ ہے نہ اعتبار۔ ان کی باتوں، ان کے اصولوں اور ان کی حرکتوں سے سخت نفرت ہے۔"

"ہر شخص کی زندگی میں یہ دور آیا کرتا ہے۔"

"یہ نہیں کہ میں اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتا۔ میں خود کو خوب جانتا ہوں۔ جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ دراصل میں دنیا سے سخت بیزار ہوں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ جیسی زندگی چاہتا ہوں وہ میسر نہیں ہوتی۔ جو میسر ہے وہ مجھے پسند نہیں۔ میں زر کا بھوکا نہیں۔ جب چاہوں ملازمت کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے آقا پسند نہیں۔ ان کے سامنے ذلیل ہونا نہیں چاہتا۔ میں نے کئی مرتبہ نوکری کی لیکن ہر مرتبہ لڑ جھگڑ کر چلا آیا۔ ہفتہ، دو ہفتے، مہینے سے زیادہ میں ملازمت نہیں کر سکتا۔ میں نے فوج میں بھرتی ہونا چاہا کہ کہیں باہر نکل جاؤں یا لڑائی میں مارا جاؤں گا۔ فوج میں کوئی کسی کو بلاوجہ تنگ نہیں کرتا۔ سلوک بھی قدرے بہتر ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے نہیں لیا۔ جسمانی معائنے میں رہ گیا۔ صرف پھیپھڑے ہی خراب نہیں تھے اور بھی کئی نقائص نکلے۔"

وہ کھانسنے لگا۔ کھانسی اتنی شدید تھی کہ دیر کے بعد سانس آیا۔ سپنگلز نے جلدی سے بوتل نکالی۔ "لو تھوڑی سی پی لو۔"

"شکریہ! ویسے تو پکا شرابی ہوں لیکن اس وقت چند گھونٹ لوں گا۔"

"کچھ مطالعے کا شوق بھی ہے؟"

"جب گھر پر تھا تو پڑھا کرتا تھا۔ والد کے پاس کتابوں کا بہت عمدہ ذخیرہ تھا۔ سب مشہور مصنفوں کی کتابیں بھی۔ مجھے ولیم بلیک کی تصنیفات بہت پسند تھیں۔ شاید آپ نے بھی پڑھی ہوں۔ شیکسپیئر، ملٹن، پوپ، ڈکنز، تھیکرے۔ سب کو پڑھا لیکن اب جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔ اب تو میں اخبار بھی نہیں پڑھتا۔ خبریں پہلے سے معلوم ہوتی ہیں۔ جھوٹ، دغا بازی، قتل و غارت۔ لوگ ہر وقت ذلیل حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ کے اخلاق اور حسنِ سلوک کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ آپ نہایت اچھے انسان ہیں۔ اگر آپ ڈر جاتے یا بری طرح پیش آئے تو میں آپ کو گولی مار دیتا۔ دنیا میں تو لوگ خوفزدہ ہیں یا ترش رَو ہیں۔ میں اب سمجھا ہوں کہ ہتھیار لے کر یہاں کیوں آیا تھا۔ لوٹ کھسوٹ کے لیے نہیں بلکہ یہ

معلوم کرنے کہ وہ انسان جو دوسرے کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آیا تھا اس کے دل میں کون سا جذبہ کار فرما تھا۔ جذبۂ انسانیت یا کچھ اور۔ اس کی شرافت محض اتفاقیہ تو نہ تھی۔ گمان تک نہ تھا کہ کوئی اتنا شائستہ بھی ہو سکتا ہے۔ آج کے واقعے نے میرے خیالات بدل دیئے ہیں۔ اب تک میں یہی سمجھتا تھا کہ نسلِ انسانی بے حد گری ہوئی ہے۔ یہاں ایک بھی ایسا نہیں جسے انسان کہا جا سکے۔ مجھے مغرور لوگوں سے بھی نفرت رہی ہے۔ اور قابلِ رحم ہستیوں سے بھی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اپنے گھر سے ہزاروں میل دور آج مجھے اچانک ایک مہذب انسان ملا ہے۔ مدّتوں میرے ذہن میں کشمکش رہی کہ کہیں ایسا انسان ہو گا بھی؟ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ مِل گیا تو میں انسانیت پر ایمان لے آؤں گا۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے۔ اب میں گھر جا کر شریفانہ زندگی بسر کرنے کی کوشش کروں گا۔" وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

سپنگلز نے نقدی واپس صندوقچے میں رکھ دی۔ ریوالور سے گولیاں نکال لیں اور اسے بھی صندوقچے میں ڈال دیا۔ پھر تاروں کے فارموں کے ایک بنڈل میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ آخر اسے وہ تار مل گیا۔ جو اس نوجوان نے اپنی والدہ کو بھیجا تھا۔ اس نے خالی فارم پر یہ پیغام لکھا:

مسز مارگرٹ سٹر کین۔ ۱۸۷۴ بڈل سٹریٹ

یارک۔ پنسلوینیا

امّی جان! رقم مل گئی۔ بہت جلد گھر پہنچوں گا۔ سب خیریت ہے۔"

جان

وہ مشین کے پاس جا بیٹھا اور تار بھیج دیا۔

گروگن واپس آکر اس کرسی پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے نوجوان بیٹھا رہا تھا۔

"طبیعت کیسی ہے؟" سپنگلز نے پوچھا۔

"بہت بہتر ہے۔ دو جام پیئے۔ پیانو پر موسیقی سُنی۔ سپاہی خوب گا رہے تھے۔"

"تمہیں مجھ سے محبّت ہے۔ ہے نا۔ ہے نا؟۔ ولی وہ بار بار یہی کہا کرتی ہے۔ میں اس سے شادی نہ کر لوں؟"

بوڑھا مسکرانے لگا۔

"ولی گیت کیسے تھے؟"

"سب پرانے تھے۔ ٹام! یاد ہے ڈیون پورٹ کیا خوش الحان تھا؟"

"اچھی طرح یاد ہے۔ میں اس کے نغمے کبھی نہیں بھول سکتا۔ گیتوں کے علاوہ حمد کتنی اچھی طرح ادا کیا کرتا۔"

"اس کی تانیں کون بھول سکتا ہے۔ یوں تو دہریہ بنا پھرتا تھا لیکن ہر اتوار کو نعتیہ نغمے گاتا تھا۔ تار بھی بھیج رہا ہے، تمبا کو بھی چبا رہا ہے، گا بھی رہا ہے۔ اس گیت سے دن شروع کرتا۔"

خوش آمدید

اے دلکش صبح

مقدس دن کی پیغام پر

آج تو روشنی ہی روشنی ہو گی

سب طلوعِ نور کے منتظر ہیں

مجھے بھی یاد ہے

سب طلوعِ نور کے منتظر ہیں

اور پھر اس کے بعد وہ گایا کرتا:

اے خدا!

اے صبح و شام کے مالک!

ہم تیری طرف سے

روشنی کے اس تحفے کے لیے ممنون ہیں؟

پھر شام ہوتی تو وہ دہریہ انگڑائی لے کر گنگناتا:

”دن ختم ہو رہا ہے

ظلمتوں کی آمد آمد ہے

اے بخشش کرنے والے

ہم پر رحم کر

نیند آنے سے پہلے

ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیں

اے مالک

توہی نجات دہندہ ہے

توہی مسیحا ہے"

گروگن خاموش ہوگیا۔ اسے اپنا بچھڑا ہوا دوست یاد آرہا تھا جسے مرے ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں۔

"نام کتنی صداقت ہے اس میں، کتنی سچائی ہے۔"

سپنگلز اُٹھا اس نے بوڑھے کے کندھے کو تھپتھپایا اور دفتر بند کرنے لگا۔

موت کا فرشتہ

ہومر سو گیا لیکن بے چینی سے بار بار کروٹ بدلتا۔ اس نے خواب دیکھا کہ دو سو بیس گز کی دوڑ ہو رہی ہے۔ وہ پھلانگتا ہے تو ہر مرتبہ بائی فیلڈ پکڑ لیتا ہے۔ آخر ٹانگ کے درد سے مجبور ہو کر وہ گر پڑا۔ اس نے بائی فیلڈ کے منہ پر مکّہ رسید کیا اور چلّایا۔ ”تم مجھے نہیں روک سکتے۔ بائی فیلڈ! میں دوڑوں گا، ضرور دوڑوں گا۔“ لکڑی کا ایک چوکھٹا تو بہت ہی اُونچا تھا۔ کوئی آٹھ فٹ کے قریب۔ لیکن اتھیکا کا شیر اسے بھی پھلانگ گیا۔

خواب کا دوسرا حصّہ شروع ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ سائیکل پر تیزی سے جا رہا ہے۔ بائی فیلڈ نے راستہ روک رکھا ہے۔

”بائی فیلڈ! کتنی دفعہ کہا ہے کہ تم مجھے نہیں روک سکتے۔“ یہ کہہ کر سائیکل سمیت وہ اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ لیکن بائی فیلڈ پھر سامنے کھڑا تھا۔ سائیکل پھر اُٹھی اور ہوا میں اُڑنے لگی۔ بائی فیلڈ پاگلوں کی طرح ہومر کو دیکھ رہا تھا جو

سائیکل سمیت بیس فٹ اُونچا اُڑ رہا تھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو! کششِ ثقل کے اصولوں کا ہی کچھ لحاظ کرو۔“

”نہ مجھے کششِ ثقل کے اصولوں کی پروا ہے نہ اعداد و شمار، طلب و رسد یا دوسرے اصولوں کی۔ مجھے تو یہ پتا ہے کہ تم مجھے نہیں روک سکتے۔ نہیں روک سکتے؟“

بائی فیلڈ کو زمین پر چھوڑ کر ہومر اُڑتا چلا گیا۔ اب وہ کالے کالے بادلوں میں سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ آسمان میں ایک اور ہرکارہ بھی ہے جو سائیکل پر جا رہا ہے۔ اور جس کی شکل ہومر سے ملتی ہے۔ ہومر نے اس کے تعاقب میں اپنی رفتار تیز کر دی۔ پہلے تو وہ دُور دُور رہے۔ پھر ہومر قریب آتا گیا۔ دوسرے ہرکارے نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ ہو بہو ہومر کی شکل تھی۔ لیکن اس کے حلیے اور چہرے کے اظہار سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کا فرشتہ ہے۔

وہ دونوں اتھیکا کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اسے پکڑنے کے لیے ہومر نے سارا زور لگا دیا۔ اب قصبے کی روشنیاں اور گلی کوچے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر موت کے فرشتے کو فوراً نہ پکڑا گیا تو آفت آجائے گی۔

آخر ہومر نے اسے آلیا۔ اور اس کا رُخ موڑ دیا۔ لیکن دوسرا ہرکارہ پھرتی سے

مُڑا اور قصبے پر اُترنے لگا۔ تھکا ہارا ہومر مایوس ہو کر رونے لگا۔ اس کی سائیکل آہستہ آہستہ گِر رہی تھی۔

"واپس آجاؤ۔ اتھیکا میں نہ جاؤ۔ انہیں کچھ نہ کہو۔ لوٹ آؤ"۔

یولی سیز جاگ اٹھا۔ بھائی کو روتے دیکھ کر سیدھا والدہ کے پاس گیا اور اسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔ ماں جاگ اُٹھی اور بغیر کچھ پوچھے اس کے ساتھ ہولی۔ پہلے اس نے یولی سیز کو بستر میں لٹایا، پھر دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ "ہومر بیٹے سو جاؤ۔ تم تھکے ہوئے ہو۔ سو جاؤ بیٹے۔ سو جاؤ۔"

ہومر کی سسکیاں بند ہو گئیں اور وہ خاموش ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں دونوں بھائی سو گئے۔

اب نہایت رنگین خواب شروع ہو گیا۔ ہومر نے دیکھا کہ وہ ندّی کے کنارے انجیر کے درخت کے نیچے لیٹا ہے۔ اسے یہ جگہ جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ یہ تو وہی گوشہ ہے جہاں پچھلی گرمیوں میں مارکس اور میں آیا کرتے تھے۔ ہم ندی میں تیرتے اور گھاس پر بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں کیا کرتے۔ اس نے مُسکرا کر انگڑائی لی اور بھول گیا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔

سب کچھ اسی طرح تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی بہتا ہوا شفاف پانی، وہی

جھومتی ہوئی روشنیاں اور موسمِ بہار کی خوشبوئیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک حسین لڑکی چلی آ رہی ہے۔ سادہ لباس پہنے، ننگے پاؤں۔ یہ تو ہیلن ہے! میری محبوبہ! وہ چھلانگ مار کر اُٹھا اور استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

دونوں خاموش تھے۔ ہومر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف چلے گئے۔ سیر کے بعد دونوں نے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ دیر تک تیرتے رہے۔ جب تھک گئے تو دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت پر لیٹ کر سو گئے۔

خوبانی کا درخت

یولی سیز علی الصبح اُٹھا۔ نئی نئی نکلی ہوئی دھوپ میں اچھلتا کودتا پڑوس کے احاطے میں چلا گیا جہاں گائے بندھی ہوئی تھی۔ وہ گائے کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ گائے کا مالک بالٹی اور سٹول لے کر آگیا اور دودھ دوہنے لگا۔ یولی سیز نے بوڑھے کے پیچھے ہو کر جھانکنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ نظر نہیں آیا، چنانچہ وہ بالکل گائے کے نیچے جا گھسا۔ بوڑھے نے اسے دیکھ لیا، لیکن چپ رہا۔

گائے نے پیچھے مُڑ کر بچّے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ گائے کی آنکھوں سے سرد مہری ٹپکتی تھی۔ جیسے اسے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی۔ یولی سیز وہاں سے ہٹ کر دور جا کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ گائے نے اس طرح دیکھا جیسے کسی دوست کو دیکھ رہی ہو۔

گھر لوٹتے ہوئے وہ ایک آدمی کے پاس سے گزرا جو احاطے کے گرد جنگلا لگا رہا تھا۔ یہ شخص اعصابی، غصّیل اور بے صبرا تھا۔ بار بار غلطیاں کرتا اور اپنے آپ

کو کوستا۔ بچّہ کچھ دیر اس کی حرکتوں کو دیکھتا رہا پھر چل دیا۔

ہفتے کا دن تھا۔ سکول کے بچّے خوش تھے۔ سامنے کے مکان سے آٹھ نو برس کا ایک لڑکا نکلا۔ یولی سیز نے اسے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ لڑکے نے جواب دیا۔ یہ لائل کیبٹ تھا جو محلّے بھر میں احمق مشہور تھا۔ لیکن بڑا خوش مزاج اور پُر خلوص بچّہ تھا۔

پھر آگسٹس گاٹلیب باہر نکل آیا۔ پہلے ہومر محلّے کے لڑکوں کا سرغنہ تھا۔ اس کے ملازم ہو جانے کے بعد یہ عہدہ آگی نے سنبھال لیا۔

آگی اپنے چیلوں کی تلاش میں نکلا تھا۔ اس کے لیے یولی سیز اور لائل دونوں بیکار تھے۔ ایک بچّہ تھا دوسرا پاگل۔

اس نے منہ میں دو انگلیاں ڈال کر سیٹی بجائی۔ تیز سیٹی سے گلی گونج اٹھی۔ ایک ایک کر کے کھڑکیاں کھلیں اور جوابی سیٹیاں بجنے لگیں۔ لڑکے گھروں سے نکلے اور ذرا سی دیر میں جتھا اکٹھا ہو گیا۔

”آج کہاں کی تیاری ہے؟“ ایک لڑکے نے آگی سے پوچھا۔

”دیکھتے ہیں کہ ہینڈرسن کی خوبانیاں پک گئی ہیں یا نہیں؟“

"میں بھی چلوں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اچھا آجاؤ۔ اگر خوبانیاں ہوئیں تو چرا ؤگے؟"

"چوری کرنا گناہ ہے۔" لائنل بولا۔

"پھلوں کی چوری گناہ نہیں۔" آگی نے فیصلہ کر دیا۔ "اور یولی سیز تم گھر چلے جاؤ۔ چھوٹے بچّوں کو ایسی خطرناک مہم پر نہیں جانا چاہیے۔"

یولی سیز تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے جتنے کے قوانین معلوم تھے۔ اس کی عمر کم تھی۔ اس لیے آگی کا حکم اسے بُرا نہیں لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر شریک نہ ہو سکے تو دور ہی سے تماشا دیکھ لیں گے۔

یہ گروہ سڑکیں اور سیدھی گلیاں چھوڑ کر دشوار اور پیچیدہ راستوں سے گزرتا، دیواریں کودتا، ہینڈرسن کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ یولی سیز پیچھے آرہا تھا۔

"دنیا کا کوئی پھل پکی ہوئی خوبانی کا مقابلہ نہیں کر سکتا!" آگی بولا۔

"لیکن خوبانیاں مارچ میں کہاں پکتی ہیں؟"

"یہ اپریل کا مہینہ ہے۔ دھوپ تیز پڑے تو کچھ خوبانیاں ضرور پک جاتی ہیں۔"

آگی نے جواب دیا۔

"کافی دنوں سے تو بارش ہو رہی ہے۔"

"خوبانیوں میں رس کہاں سے آجاتا ہے؟" کسی نے سوال کیا۔

"بارش کی نمی سے۔ بارش بھی اتنی ضروری ہے جتنی کہ دھوپ۔" آگی نے بتایا۔

"تو دن میں دھوپ اور رات کو بارش۔ تاکہ تمازت بھی پہنچ جائے اور نمی بھی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خوبانیاں تیار ہیں۔"

"مجھے بھی یقین سا ہو چلا ہے۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"لیکن پچھلے سال تو کہیں جون میں جا کر پکی تھیں۔ ابھی تو اپریل ہی شروع ہوا ہے۔"

"وہ پچھلا سال تھا، یہ نیا سال ہے۔" آگی بولا۔

دُور خوبانیوں کا درخت نظر آرہا تھا۔ سرسبز پھلوں سے لدا پھندا درخت پچھلے دس برس سے محلّے کے لڑکوں کی توجّہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہینڈرسن کی عادت تھی کہ پہلے تو چھپا رہتا پھر یکلخت باہر نکل کر لڑکوں کو بھگا دیتا۔ اس نے کھڑکی سے

جھانک کر دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"سردیاں ختم نہیں ہوئیں اور چھوکرے خوبانیاں توڑنے آ پہنچے۔ آج تو ایک نیا شکاری بھی آیا ہے۔ کتنا چھوٹا سا ہے۔ مشکل سے چار برس کا ہو گا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"چرالو بھئی لڑکو بوڑھے ہینڈرسن کا پھل! اب مارچ میں تمہارے لیے پکی ہوئی خوبانیاں کہاں سے لاؤں"۔

آگی حملے کی تیاری میں مشغول تھا اور لڑکوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ مختلف سمتوں سے لڑکے دبے پاؤں درخت کی طرف بڑھنے لگے۔ خوبانیاں کچی ہوں یا پکی، ہینڈرسن کے درخت پر لگی ہوئی ہیں اور جو خوبانیاں درخت پر ہوں ان کا توڑنا جائز ہے۔"

لیکن وہ ڈرے ہوئے بھی تھے۔ گناہ کا خیال اور پکڑے جانے کا خوف۔

"معلوم تو یہی ہوتا ہے بوڑھا گھر میں نہیں ہے۔" ایک لڑکا بولا۔

"وہ گھر ہی میں ہو گا۔ بھلا ہم آئیں اور وہ یہاں نہ ہو۔ وہ ہمیں دھوکے سے پکڑنا چاہتا ہے۔ سب خبر دار رہو۔ اور یولی سیز تم فوراً گھر چلے جاؤ۔"

بچّے نے آگی کا حکم مان لیا اور تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"کیسی ہیں خوبانیاں؟ زرد ہو گئیں یا نہیں؟"

"زردی تو نہیں نظر آ رہی۔ مگر یہ تو پتوں میں چھپی ہوئی ہوں گی۔ یہ لائنل کہاں چلا گیا؟"

"یہ رہا۔" لائنل بے حد ڈرا ہوا تھا۔

"شاباش! چوکنے رہو۔ بوڑھا نظر آئے تو سرپٹ بھاگنا۔"

"کہاں ہے بوڑھا؟" لائنل نے اس طرح پوچھا جیسے بوڑھا کوئی چھوٹی سی چیز ہو گی جو دفعتاً خرگوش کی طرح گھاس میں سے نکل آئے گی۔

"مجھے کیا پتہ کہاں ہے۔" آگی بولا۔ "شاید گھر میں چھپا ہوا ہو یا آس پاس تاک لگائے بیٹھا ہو۔"

"آگی درخت پر تم پڑھو گے نا؟"

"درخت پر میرے سوا کون چڑھ سکتا ہے! پہلے دیکھ تو لو خوبانیاں کیسی ہیں۔"

"سبز ہوں یا زرد، اب آ گئے ہیں تو توڑ کر رہیں گے۔" ایک لڑکا بولا۔

"آگی کل سکول کس منہ سے جاؤ گے؟" لائنل نے پوچھا۔

"کہہ تو دیا کہ پھلوں کی چوری اس چوری سے مختلف ہے جس کا ذکر انجیل میں آیا ہے۔" آگی نے جواب دیا۔

"تو پھر خوف زدہ کیوں ہو؟"

"خوف زدہ کون مسخرا ہے! احتیاط کو یہ خوف سمجھتا ہے۔ خواہ مخواہ پکڑے جانے سے فائدہ۔"

"مجھے تو زرد خوبانیاں نظر نہیں آئیں۔" لائنل بولا۔

"تمہیں درخت تو نظر آتا ہے؟"

"ہاں ہرے رنگ کا درخت نظر آ رہا ہے۔"

وہ درخت کے نیچے کھڑے تھے، یولی سیز ذرا دور تھا۔ اسے کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اتا پتا تھا کہ درختوں اور خوبانیوں کے سلسلے میں کوئی کاروائی کی جا رہی ہے۔ لڑکوں نے ایک ایک ٹہنی کا غور سے مطالعہ کیا۔

"سب کچی ہیں۔"

"ہاں۔ میرے خیال میں پرسوں تک پک جائیں گی یا زیادہ سے زیادہ ہفتے تک۔"

"یہ ہیں کتنی ساری! ٹہنیاں ٹوٹی پڑی ہیں!!"

"آگی! ہم خالی ہاتھ لوٹ جائیں گے کیا؟ ایک آدھ توڑ لو۔"

"اچھا۔ سب فرار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں توڑ تا ہوں۔" آگی نعرہ لگا کر بلّی کی طرح درخت پر چڑھ گیا۔

پوراجتھا حیرت سے آگی کے کرتب دیکھ رہا تھا۔ یولی سیز اور ہینڈرسن بھی محوِ تماشا تھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ہینڈرسن باہر نکلا۔ لڑکے سرپٹ بھاگے۔

"آگی! ہینڈرسن آ پہنچا۔" کوئی بھاگتے بھاگتے چلایا۔

آگی لنگور کی طرح ٹہنیوں سے پھسلتا ہوا نیچے اترا۔ زمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے ہی تابڑ توڑ بھاگا۔ دفعتاً اسے یاد آگیا کہ یولی سیز پیچھے رہ گیا ہے۔

"بھاگو۔ یولی سیز۔ بھاگو۔"

لیکن بچّہ اطمینان سے وہیں کھڑا رہا۔ آگی واپس آیا اور جلدی سے اسے دبوچ کر ہوا ہو گیا۔

بوڑھا ہینڈرسن انہیں دیکھتا رہا۔ جب سب لڑکے غائب ہو گئے اور خاموشی چھا گئی تو مُسکراتا ہوا گھر میں چلا گیا۔

خوش رہو

لڑکے بھاگم بھاگ بڑے چوک میں پہنچے اور اپنے سر کردہ کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد جاں نثار چیلوں نے دیکھا کہ استاد آگی ننھے یولی سیز کا ہاتھ پکڑے آرہا تھا۔ سب اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"آگی، کچھ ملا؟"

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے؟ مجھے درخت پر چڑھتے دیکھا تھا یا نہیں؟"

"تو پھر دکھاؤ خوبانی کہاں ہے؟"

یولی سیز بڑے انہماک سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب تک نہ سمجھ سکا تھا کہ لڑکے کس چکر میں ہیں، لیکن اسے یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

لڑکوں نے آگی کو گھیر لیا۔ "اچھا دیکھیں۔ کہا ہے خوبانی؟"

آگی کا ہاتھ جیب میں گیا۔ جیب سے مٹھی نکلی۔ سب کی نگاہیں مٹھی پر جمی ہوئی

تھیں مٹھی آہستہ آہستہ کھلی۔ آگی کی ہتھیلی پر چھوٹی سی سبز خوبانی رکھی تھی۔ اس کے مداحوں کے چہرے مسرّت سے دمکنے لگے۔ وہ اپنے قائد کو بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔ لائنل نے یولی سیز کو گود میں اٹھالیا کہ کہیں وہ اس نظارے سے محروم نہ رہ جائے۔

خوبانی دیکھتے ہی یولی سیز گھر کی طرف بھاگا کہ یہ کہانی کسی کو سُنائے۔

چوک کی بڑی دکان سے ایک لمبے قد کا فلاسفر نما شخص باہر نکلا۔ یہ مسٹر ایرا تھا، جو سات برس سے پھلوں کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ کچھ دیر آگی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھتا رہا۔

"لڑکو یہ کیا ہو رہا ہے؟ ریاست ہائے متحدہ کی کانگریس کا اجلاس! چلو بھاگو! دکان کے سامنے جلسے نہیں کیا کرتے۔"

"مسٹر ایرا، ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔ آپ کو خوبانی دکھائیں؟" آگی بولا۔

"خوبانی۔ خوبانی کہاں سے ملی؟"

"درخت سے توڑ کر لائے ہیں۔"

"ابھی سے کہاں دھری ہیں خوبانیاں۔ دو مہینے بعد کہیں آئیں گی، مئی میں۔"

”جی نہیں، یہ مارچ کی خوبانی ہے۔ دیکھئے کیسی حسین و جمیل ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔“

”اچھا اچھا دیکھ لی۔ اب کہیں اور جا کر جلسہ کرو۔ سنیچر بیوپار کا دن ہوتا ہے۔ تم نے صبح ہی صبح دکان پر بھیڑ لگا دی۔ گاہک بِدک کر اِدھر اُدھر چلا جائے گا۔“

”بہت اچھا مسٹر ایرا۔ ہم جاتے ہیں۔ چلو لڑکو۔“

ایرا انہیں سڑک عبور کرتے دیکھ رہا تھا۔ جب لڑکے دور نکل گئے تو وہ واپس دکان میں آ گیا۔ اندر ایک چھوٹا سا لڑکا کھڑا تھا جس کی شکل ہو بہو ایرا پر تھی۔

”ابّا“

”ہاں بیٹے۔“ ایرا نے آرمینی زبان میں کہا۔

”سیب لوں گا۔“

باپ نے سیبوں کے ڈھیر میں سے ایک اچھا سا دانہ چُنا۔

”یہ لو سیب۔“

وہ اپنے بیٹے کو دیکھنے لگا۔ لڑکا کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ بشاشت غائب تھی جو عموماً

بچّوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔ ایسی ہی پژمردگی باپ کے چہرے پر تھی حالانکہ ان کی عمروں میں کوئی چالیس برس کا فرق ہو گا۔ بچّے نے سیب چکھا اور کسی خیال میں کھو گیا۔ باپ سمجھ گیا کہ سیب لے کر بچّہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا۔ بچّے نے سیب ایک طرف رکھ دیا اور باپ کو دیکھنے لگا۔

اپنے آبائی وطن سے سات ہزار میل دور۔ وہ دونوں اتھیکا میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ شاید دل کی ویرانی تھی یا احساسِ تنہائی جس کی وجہ سے دونوں اداس تھے۔ لیکن یہ اداسی سات ہزار میل پرے اپنے وطن میں بھی ہو سکتی تھی۔ باپ غور سے اپنے بیٹے کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اپنے چہرے کا عکس تھا۔ وہی خدوخال وہی آنکھیں، آنکھوں سے جھلکتی ہوئی وہی اداسی۔ دونوں بالکل ایک جیسے تھے۔ فقط ایک کم عمر تھا۔ باپ نے سیب اٹھا لیا اور خود کھانے لگا۔ اسے سیب کچھ زیادہ پسند نہیں تھے۔ بھوک بھی نہیں تھی، پھر بھی وہ کھانے لگا۔ اگر بیٹے نے نہیں کھایا تو اتنا اچھا سیب ضائع ہو جائے گا۔ اس کا اصول تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ مشکل سے اس نے سیب ختم کیا۔

''ابّا''

”ہاں بیٹے۔“

”نارنگی لوں گا۔“

باپ نے ایک اچھی سی نارنگی چُن کر بیٹے کو دے دی۔

”لو نارنگی۔“

لڑکا چھلکا اُتارنے لگا۔ اتنی تیزی سے نارنگی چھیلتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ بیٹا خوش ہوا ہے لیکن لڑکے نے دو پھانکیں کھا کر نارنگی ایک طرف رکھ دی۔ باپ کو نارنگی بھی کھانی پڑی۔ اس مرتبہ اس نے نصف سے زیادہ نارنگی کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دی۔

”ابّا۔“

”ہاں بیٹے۔“

”مٹھائی لوں گا۔“

اس نے الماری کھول کر سب سے لذیذ اور عمدہ مٹھائی کی بڑی ساری ڈلی لڑکے کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

"یہ رہی مٹھائی۔"

لیکن لڑکے کو لطف نہ آیا۔ مٹھاس کے سوا اس میں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اس نے ڈلی کا بچا ہوا حصّہ باپ کو واپس دے دیا۔ محض ضائع نہ کرنے کے خیال سے اس نے ایک لقمہ لے تو لیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے بھی پھینک دیا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چلا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان لوگوں کو کوس رہا تھا جو نِرے گنوار اور جنگلی تھے۔ جو کئی ہزار میل دور آباد تھے۔

"ابّا"

"ہاں بیٹے۔"

"کیلا لوں گا۔"

باپ نے لمبا سانس لیا۔ ابھی وہ بالکل نا امید نہیں ہوا تھا۔ اس نے گچھے سے بڑا سا پکا ہوا کیلا توڑا۔

"یہ لو کیلا۔"

ایک گاہک دکان میں آ گیا۔ دونوں سے سر ہلا کر علیک سلیک کی۔

"آپ کے پاس شیر مال ہیں؟" گاہک نے پوچھا۔ "کس قسم کے شیر مال ہیں؟"

اتنے میں ایک اور گاہک آ گیا۔ یہ یولی سیز تھا جو کونے میں کھڑا غور سے باتیں سُن رہا تھا۔

"شیر مال جن میں کشمش ہوں۔" پہلے گاہک نے بتایا۔

"کشمش والے شیر مال۔ جن میں کشمش ہوں۔ دیکھتا ہوں۔"

ایرا الماریاں کھولنے لگا۔ اس کا لڑکا بچا ہوا کیلا لے کر سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اب۔"

باپ نے غصّے سے دیکھا۔ "تم نے سیب مانگا میں نے سیب دیا۔ نارنگی مانگی، وہ دی پھر مٹھائی لی، کیلا۔ اب کیا چاہیے؟"

"شیر مال لوں گا۔"

"کیسا شِیر مال؟"

اس کا روئے سخن بیٹے کی طرف تھا، گاہک کی طرف تھا۔ اور ان کی سب لوگوں کی طرف بھی جو ہر وقت چیزیں مانگتے رہتے ہیں۔

''جس میں کشمکش ہوں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

باپ نے غصّہ ضبط کر لیا، بیٹے سے کچھ کہنے کی بجائے گاہک سے بولا۔

''دکان میں اور سب چیزیں ہیں لیکن شیر مال نہیں ہیں۔ ویسے کیا کریں گے آپ شیر مال کا؟''

''ایک بچے کو دوں گا۔''

''یہ میرا بچہ جو آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ سیب، نارنگی، مٹھائی کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا خرافات مانگتا رہتا ہے۔ لیکن اسے کچھ بھی پسند نہیں آتا۔''

''میرے بھتیجے کو تیز بخار ہے۔ وہ رو رہا ہے۔ بار بار یہی کہتا ہے کہ کشمش والا شیر مال لوں گا۔'' گاہک بولا۔

''ابّا'' ایرا کے لڑکے کو ایک ہی دُھن لگی ہوئی تھی۔ نہ اسے گاہک کی پروا تھی نہ باپ کی۔

ایرانے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ گاہک کو دیکھنے لگا جس کا بھتیجا بیمار تھا۔ اسے گاہک سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں کئی چیزوں کے لیے نفرت عود کر آئی۔ بیماری، درد، تنہائی، کسی شے کی جستجوئے لا حاصل۔ اپنے اوپر غصّہ آنے لگا کہ

وطن سے ہزاروں میل دور آکر دکان کھولی۔ لیکن ایک بار بچّے کے لیے شیر مال کی ضرورت ہوئی تو وہی اس کے پاس نہ نکلا۔

اس نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے بیٹے کو لیجئے۔ یہ اچھا بھلا ہے، تندرست ہے۔ اسے سیب چاہیے۔ نارنگی چاہیے، مٹھائی، کیلا اور نہ جانے کیا کیا چاہیے۔ دراصل کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ سب دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ خدایا! ہمیں یہ عطا فرما۔ وہ عطا فرما۔ انسان ہر وقت غیر مطمئن اور کچھ نہ کچھ مانگتا ہی رہتا ہے۔ اس دائمی وحشت کا کیا علاج ہے؟ خدا نے ہمیں سبھی کچھ تو دے دیا۔ زندگی، روشنی، دھوپ، محبت کرنے والے عزیز و اقارب، گھر کی سکون بخش فضا، لیکن ناشکرا انسان اس بچّے کی طرح غمگین رہتا ہے جسے بخار چڑھا ہوا ہو۔ بار بار یہ شیر مال مانگتا ہے جس میں کشمش ہوں۔“

ایرانے کاغذ کا تھیلا لیا اور اس میں چیزیں بھرنے لگا ”یہ شیریں نارنگیاں ہیں۔ یہ خوشبودار سیب۔ یہ لذیذ کیلے۔ میری طرف سے اپنے بھتیجے کو دے دیجیے۔ شاید وہ بہل جائے۔ قیمت ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو شیر مال نہ دے سکا۔“

”شکریہ! میں یہ تھیلا اسے دے دوں گا مگر اس پر تو جیسے بھوت سوار ہے۔ بار بار

شیر مال مانگتا ہے۔ اگلی دکان پر نہ پوچھ لوں؟"

"پوچھ لیجئے۔ لیکن کشمش والے شیر مال ان کے ہاں بھی نہیں ہیں۔ یہاں کسی کے ہاں نہیں ملیں گے۔"

گاہک چلا گیا۔ ایرا اپنے بیٹے کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اپنی مادری زبان میں زور زور سے بولنے لگا۔ "دنیا پاگل ہو گئی ہے۔ ہمارے وطن کے پڑوس میں روس ہی کو دیکھو۔ لاکھوں بچّے اور بڑے بھوکوں مر رہے ہیں۔ دن بھر ٹھٹھرتے ہوئے، ننگے پاؤں مارے مارے پھرتے ہیں۔ رات کو سونے کے لیے چھت کا سایہ تک میسر نہیں۔ اور ہم ہیں کہ امریکہ میں گلچھڑے اُڑا رہے ہیں۔ بڑھیا جوتے اور قیمتی کپڑے پہن کر سیریں کرتے ہیں۔ کوئی پستول لے کر ہمارا تعاقب نہیں کرتا۔ کوئی بندوق لے کر ہمارے عزیزوں کو مارنے نہیں آتا۔ کوئی ہمارے مکان نہیں جلاتا۔ ہم موٹروں میں اُڑے پھرتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا میسر ہے۔ زندگی کی سب آسائشیں موجود ہیں لیکن ہم پھر بھی خوش نہیں ہیں۔ غمگین رہتے ہیں۔ سیب، نارنگی، مٹھائی، کیلا۔ بیٹے خدا کے لیے ایسی حرکتیں مت کیا کرو۔ ان سے ناشکری ٹپکتی ہے۔ میں کروں تو کوئی بات بھی ہے۔ لیکن تم میرے بیٹے ہو اور تمہیں مجھ سے بہتر ہونا چاہیے۔ ہمیشہ خوش رہو۔ میں غمگین ہوں تم تو خوش رہا کرو۔"

اس نے عقبی دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔ بچّہ چُپ چاپ گھر میں چلا گیا۔

ایرا نے یولی سیز کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔

”ننھے تمہیں کیا چاہیے؟“

”دلیا۔“

”کس قسم کا دلیہ؟“

”ناشتے کا۔“

”دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک زود ہضم ہے اور دوسرا کچھ ثقیل لیکن منٹوں میں تیار ہوتا ہے۔ کون سا دوں؟“

”ناشتے کا دلیہ۔“

”زود ہضم یا دوسرا؟“

”جی دلیہ جو ناشتے میں کھایا جاتا ہے۔“

”اچھا، زود ہضم لے جاؤ۔ آٹھ سینٹ ہوئے۔“

یولی سیز نے مٹھی کھول کر چمکدار سکہ نکالا۔ ریز گاری اور دلیے کا پیکٹ لے کر دکان سے باہر آ گیا۔ آج کے واقعات ایک حد تک ناقابلِ فہم تھے۔ پہلے خوبانیوں کا درخت، پھر کشمش والا شیر مال اس کے بعد مسٹر ایرا کی کسی اجنبی زبان میں تقریر۔

خیر جو کچھ بھی تھا کافی دلچسپ تھا۔

یولی سیز نے طرارہ بھرا اور گھر کی طرف بھاگنے لگا۔

احساسِ غم

مسز میکالے ناشتے پر ہومر کا انتظار کر رہی تھیں۔ یہ گرم گرم دلیا پیالے میں ڈال ہی رہی تھی کہ ہومر آ گیا۔ اس نے بیٹے کی جھلک ہی سی دیکھی، لیکن بھانپ گئی کہ رات کے خواب کا اثر اب تک باقی ہے۔ ہومر کو یاد بھی نہ تھا کہ وہ خواب میں رویا تھا۔ لیکن وہ کچھ دہشت زدہ سا تھا۔ جیسے کسی صدمے کے بعد انسان دیر تک سہما رہتا ہے۔

"آج تو بہت دیر ہو گئی۔ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ پتہ نہیں الارم کیوں نہیں بجا۔" ہومر نے کہا۔

"تم محنت بہت کرتے ہو۔ آرام بھی کیا کرو۔"

"جی نہیں، زیادہ محنت تو نہیں کرتا۔ کل اتوار ہے نا؟"

اس نے دُعا پڑھی جو آج بے حد طویل معلوم ہوئی۔ دلیہ کھانے کے لئے چمچہ اٹھایا۔ پھر کچھ سوچ کر رکھ دیا۔

"امّی۔"

"ہاں ہومر۔"

"رات کو میں آپ سے باتیں کیے بغیر ہی سو گیا۔ آپ نے کہا تھا کہ بعض اوقات باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ گھر آتے وقت میرا دل بھر آیا۔ اور آنسو آ گئے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ بچپن میں بھی میں کبھی نہیں رویا۔ روتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ یولی سیز بچّہ ہے مگر یہ بھی نہیں روتا۔ رونے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ لیکن کل بات نہ جانے کیا ہوا میرے آنسو نہ تھمتے تھے۔ گھر آنے کی بجائے میں سڑکوں پر پھرتا رہا۔ سکول کی طرف بھی گیا۔ اس مکان کے قریب سے بھی گزرا جہاں شام کو پارٹی ہو رہی تھی اور میں تار دے کر آیا تھا۔ امّی آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ تار کس قسم کا تھا۔ دیر تک یونہی آوارہ پھرتا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس قصبے کے گلی کوچوں، عمارتوں اور باشندوں کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ان پر بہت ترس آیا۔ بڑی دعائیں مانگیں کہ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ بڑا ہو کر کوئی نہیں روتا۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ انسان روتا ہی تب ہے جب اسے سمجھ آ جائے۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ "امّی جب سمجھ آتی ہے تو جی بہت بُرا ہوتا ہے۔ چاروں

طرف اتنی برائیاں کیوں ہیں؟ اتنا حزن کیوں ہے؟“

”تم خود جان لوگے بیٹے! ہر شخص اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ غم خواہ حسین ہو، خواہ کریہہ۔ محسوس کرنے والے کی روح کا عکس ہوتا ہے۔ خوشنما، مسرور یا مغموم و پر درد چیزیں فی الحقیقت کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ بلکہ یہ انسان کے محسوسات کا جزو ہیں اور ہر انسان بذاتِ خود پوری کائنات ہے۔ اس کے گرد دنیا گھومتی ہے۔ وہ چاہے تو محبّت سے دنیا کو محیط کرلے۔ وہ چاہے تو نفرت اور بغض و عناد کی بارش ہونے لگے۔ خود انسان کی دنیا میں تغیر لاتا ہے۔“

مسز میکالے گھر کا کام کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ دوسرے کمرے میں بھی چلی جاتی، لیکن ماں بیٹے کی گفتگو جاری رہی۔

”پتہ نہیں میں کیوں رویا۔ ایسے خیالات کبھی میرے دل میں نہیں آئے اور جب رو چکا تو اتنی دیر تک خاموش کیوں رہا۔ کسی سے بات نہیں کی۔“

”تمھیں ترس آ گیا۔ اور تم رو دیئے۔ یہ ترس کسی خاص شخص کے رنج و حزن پر نہیں آیا۔ یہ سب کے لیے تھا۔ کائنات کی ہر شے کے لیے۔ انسان کے دل میں ترس نہ ہو تو وہ انسان نہیں۔ اسی جذبے سے وہ مرہم پیدا ہوتا ہے جس سے زندگی کے زخم مندمل ہوتے ہیں۔ انسان جبھی روتا ہے جب اسے کائنات کے

دکھ درد کا احساس ہو۔ اگر یہ احساس معدوم ہو تو پھر وہ خاک کے ذرّے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ خاک سے تو کونپلیں پھوٹتی ہیں، پھول کھلتے ہیں لیکن بے ترس انسان کی روح بالکل بنجر ہے، جہاں روئیدگی مفقود ہے۔ جہاں صرف غرور و انا پرورش پاتے ہیں جو تباہی کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔"

ماں ناشتے کے انتظام میں مصروف تھی۔ ہومر کے سامنے چیزیں رکھ رہی تھی۔

"بیٹے! یہ احساسِ غم ہمیشہ رہے گا۔ لیکن کبھی مایوس مت ہونا۔ نیک نفس دوسروں کا غم بٹاتے ہیں۔ برداشت کی عادت ڈالتے ہیں۔ لیکن ایک احمق غم کو غم تبھی سمجھتا ہے اگر وہ اس کی ذات سے متعلق ہو۔ بد فطرت انسان ہر جگہ غم تقسیم کرتا ہے۔ دوسروں کو غمگین دیکھ کر تسکین محسوس کرتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو کوئی بھی قصوروار نہیں۔ اچھے، بُرے، کمینے سب بے قصور ہیں کیوں کہ یہ خود یہاں نہیں آئے۔ بُرے کو اپنی برائیوں کا احساس نہیں اس لئے وہ معصوم ہے۔ اسے ہمیشہ معاف کر دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ شفقت سے پیش آنا چاہیے کیونکہ وہ اِسی کائنات کا ایک حصّہ ہے۔ انسانی فطرت میں اچھائی، برائی، نیکی، بدی اس طرح ملی جلی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے کردار و افعال کے ذمہ دار ہیں۔ کسان کی دعا میری دعا ہے۔ قاتل کا جرم میرا جرم ہے۔ بیٹے تم اس لیے روئے کہ تم ان باتوں کو سمجھنے

لگے ہو۔"

ہومر نے دلیے میں دودھ ڈالا اور کھانے لگا۔

وہ مزے کی غلطیاں

یولی سیز کا گہرا دوست لائل اس سے ملنے آیا۔ دونوں چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان کی پختہ دوستی میں کسی شے کی گنجائش نہیں رہی تھی حالانکہ دونوں کی عمروں میں چھ سال کا فرق تھا۔

"مسز میکالے۔یولی سیز کو اپنے ساتھ لائبریری لے جاؤں؟" لائنل نے پوچھا۔

"ضرور لے جاؤ۔ لیکن آج تم اکیلے ہو، دوسرے لڑکے کہاں گئے؟"

"وہ مجھے ساتھ نہیں لے گئے۔شاید میں انہیں پسند نہیں۔ مسز میکالے میں ضرور احمق سا لگتا ہوں گا۔"

"نہیں تو۔ میں تو تمہیں بڑا اچھا لڑکا سمجھتی ہوں۔ اپنے ساتھیوں سے خفا نہ ہوا کرو۔ تم سب اچھے ہو۔"

"میں خفا تو نہیں ہوا۔نہ انہیں ناپسند کرتا ہوں لیکن مجھ سے ذرا سی غلطی ہو جائے

تو سب پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے تیور بدلتے ہی میں خود دوڑ جاتا ہوں۔ بعض اوقات تو غلطی کا پتا تک نہیں چلتا اور منٹوں میں دوڑنا پڑتا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کوئی کچھ سکھاتا ہی نہیں۔ نکتہ چینی کرنے کو سب تیار رہتے ہیں۔ بس میرا تو ایک ہی درست ہے، یولی سیز۔ یہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک دن وہ ضرور پچھتائیں گے اور معافی مانگیں گے۔ میں فوراً انہیں معاف کر دوں گا۔ پھر انہیں دُگنا افسوس ہو گا۔ مسز میکالے پانی پیؤں گا۔"

مسز میکالے نے پانی کا گلاس دیا جسے لائنل غٹا غٹ پی گیا۔

"تم پیو گئے یولی سیز؟" اس نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"ہاں۔"

مسز میکالے نے اسے بھی گلاس دیا۔

"اچھا اب ہم لائبریری جائیں؟"

دونوں چلے گئے۔

ہومر چھوٹے بھائی کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"امّی، یولی سیز بھائی مارکس پر گیا ہے۔"

"کیسے؟"

"یونہی مجھے لگتا ہے کہ بھائی مارکس بچپن میں یولی سیز کی طرح ہوں گے۔ ہر وقت متجسس، ہر چیز میں دلچسپی، بظاہر خاموش لیکن دل ہی دل میں سوچتے رہنا۔ ننھے کو سب اچھے لگتے ہیں۔ اسے بھی ہر کوئی پسند کرنے لگتا ہے۔ ابھی باتیں کرنا نہیں سیکھا لیکن چہرے کے اظہار سے پتہ چل جاتا ہے کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ بھائی مارکس بھی ایسے ہی تھے۔"

"بھائیوں میں مشابہت تو ہوتی ہے۔ لیکن مارکس اور طرح کا تھا۔"

"یولی سیز کسی روز بہت بڑا آدمی بنے گا۔"

"شاید دنیا کی نگاہوں میں بڑا آدمی نہ بنے۔ لیکن روشن مستقبل کے آثار ابھی سے ظاہر ہیں۔"

"یہ خوبیاں تو مارکس میں بھی ہوں گی۔"

"یوں تو تم سب آپس میں ملتے جلتے ہو لیکن مارکس میں اتنی چستی نہیں تھی جتنی تم میں ہے۔ وہ پھُرتیلا ضرور تھا لیکن اس قدر نہیں۔ وہ فطرتاً شرمیلا ہے۔

یولی سیز کی طرح اسے دوسروں میں اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تنہائی پسند تھی۔ زیادہ وقت مطالعے اور موسیقی میں صرف کرتا یا اکیلا سیر کو نکل جاتا۔"

"ویسے ننھے کو بھائی مارکس بہت پسند ہیں۔"

"لیکن اسے مارکس سے تو خاص لگاؤ ہے۔ شاید اس لیے کہ مارکس میں ابھی تک بچپنا ہے۔ فوج میں چلے گئے تو کیا ہوا۔ یولی سیز کو ایسی طبیعت کے انسان بہت پسند ہیں۔ کاش کہ میری نشوونما یولی سیز کے بچپنے جیسی ہو سکتی۔ اس کی کئی خوبیوں کو تو میں بہت سراہتا ہوں۔ اس نے کل کے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا؟"

"ایک لفظ بھی تو نہیں کہا۔ آگی نے آکر سارا قصہ سنایا۔"

"گھر پہنچ کر اس نے کچھ تو کہا ہوگا۔"

"نہیں کچھ بھی نہیں۔ آکر موسیقی سُنتا رہا۔ کھانے کے بعد جب اسے بستر پر لٹایا تو سونے سے پہلے اس نے ایک نام لیا۔ موٹا کرِس۔ ہم نے یہ نام پہلے تو نہیں سُنا تھا۔ آگی نے سب کچھ بتایا۔"

"موٹے کرِس نے یولی سیز کو پھندے سے نکالا۔ غریب کو بیس ڈالر بھی دینے پڑے کیونکہ پھندا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ پھندا ابھی برائے نام ہی ہے۔ میرے خیال

میں تو یولی سیز کے علاوہ اور کسی کو نہیں پھانس سکتا۔ کون سا جانور ہے جو ایسی بے ہنگم مشین کے قریب پھٹکے گا۔ امّی آپ نے یہ نہیں بتایا کہ یولی سیز کس پر گیا ہے۔"

"اپنے ابّا پر۔"

"آپ نے ابّا کا بچپن دیکھا تھا؟"

"کیسے دیکھ سکتی تھی؟ وہ مجھ سے سات برس بڑے تھے۔ ننھا ہو بہو ان جیسا ہے۔"

مسرت سے مسز میکالے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میں بے حد خوش نصیب ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے بچّوں میں انسانیت کا مادہ ہے۔ اگر وہ نِرے بیٹے ہی ہوتے تو میں اپنے آپ کو اتنی خوش قسمت نہ سمجھتی۔ یہ انسانیت کا جذبہ تھا جس نے تمہیں کل رات رُلایا۔ تم دنیا کے کروڑہا باشندوں میں سے ایک ہو۔ زندگی کا دلچسپ تجربہ تمہارے لیے ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ زندگی میں اچھائی بھی ہے برائی بھی حُسن، بدصورتی، ظلم، سخاوت۔ سب ملے ہوتے ہیں۔ ان سب عناصر سے زندگی بنتی ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ تم سوتے میں بھی روئے تھے"

"اچھا؟" ہومر حیران تھا کہ خود اسے کچھ پتہ نہ چلا!

"ہاں رونے سے یولی سیز جاگ گیا۔ اس نے مجھے اُٹھایا۔ میں نے خود تمہیں روتے سُنا۔ لیکن آواز تمہاری نہیں تھی۔ میں نے پہلے کئی مرتبہ تمہیں روتے سُنا ہے۔ لیکن یہ رونا تمہارانہ تھا۔ یہ مختلف تھا۔ یہ تو ساری دنیا کا گریہ تھا۔ تم غمِ زندگی سے شناسا ہو چکے تھے۔ اب ایسا دور ہو گا جس میں تم غلطیاں کرو گے۔ وہ سب غلطیاں جو سارے انسان کرتے ہیں۔ تم نو عمر ہو سُن لو۔ جو غلطیاں تم سے سرزد ہوں، ان کے اعتراف سے کبھی مت ڈرنا۔ اپنے آپ پر بھروسہ رکھو۔ ہر کام صحیح طریقے سے کرو۔ اگر ناکام ہو یا دوسروں کے جھانسے میں آجاؤ تو ہار کبھی نہ ماننا۔ گر کر اُٹھنا مردوں کا شیوہ ہے۔ زندگی میں قہقہے بھی ہیں اور آنسو بھی۔ لیکن غم میں مسرت کی آمیزش ہے اور آہوں میں مسکراہٹوں کی رمق ہے۔ کمینگی، شرارت اور تنگ نظری سے ہمیشہ بچنا۔ خدا نے چاہا تو تمہاری بلند خیالی اور شرافت مشعلِ راہ کا کام دے گی۔"

مسز میکالے بیٹے کے پاس آ کھڑی ہوئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"میں تمہیں صبح و شام نصیحتیں کرتی رہتی ہوں۔ برا تو نہیں مانتے؟"

"ہرگز نہیں، امّی۔" ہومر ناشتہ ختم کر کے کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ نیچے آگی اور

اس کے دوست فٹ بال کھیل رہے تھے۔

”تمہاری ٹانگ میں چوٹ تو نہیں لگی؟“

”جی نہیں یونہی موچ آگئی تھی۔ امی آپ بہت اچھی ہیں۔ اتنی اچھی امّی تو کسی کی بھی نہیں ہوں گی۔“

وہ کھیل میں محو ہو گیا۔ آگی گول کرنے جا رہا ہے۔ گول ہو گیا۔ میرے لیے تو سب کھیل ختم ہو گئے ہیں۔ مجھے تار گھر پہنچنا ہے۔

”امی میں بھول ہی گیا۔ آپ کے بھیجے ہوئے کھانے میں سے مسٹر گروگن نے ایک سینڈوچ کھائی تھی۔ وہ آپ کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔“

ہومر تار گھر چلا گیا۔

ماں کچھ دیر کھڑی سڑک کی طرف دیکھتی رہی۔ مڑی تو یوں معلوم ہوا جیسے اس کا مرحوم خاوند سامنے کھڑا ہے۔

”کیٹی۔“

”جی“

"مارکس بہت جلد میرے پاس آنے والا ہے۔ کیٹی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میتھیو۔"

لائبریری

لائنل اور یولی سیز لائبریری جارہے تھے کہ چوک کے گرجے سے جنازہ نکلتا دکھائی دیا۔ تابوت کے ساتھ ساتھ نوحہ خواں چل رہے تھے۔

"یولی سیز چلو، جنازہ دیکھیں۔ کسی کا انتقال ہوا ہے۔" لائنل نے کہا۔

وہ یولی سیز کا ہاتھ پکڑ کر بھاگا۔ دونوں تابوت کے قریب پہنچ گئے۔

"یہ تابوت ہے۔ اس میں میّت ہوتی ہے۔ پتا نہیں کس کی ہے۔ یہ پھولوں کے گلدستے ہیں۔ جب انتقال ہوتا ہے تو لوگ پھُول چڑھاتے ہیں۔ یہ سب نوحہ خواں ہیں۔ غالباً مرنے والے کے دوست ہوں گے۔" لائنل اپنے دوست کو سمجھا رہا تھا۔

"جی، کن کا انتقال ہوا ہے؟" لائنل نے ایک شخص سے پوچھا جو رومال سے آنسو پونچھ رہا تھا۔

"بیچارہ جونی میری ویدر چل بسا۔"

لائنل نے یولی سیز کے کان میں دہرایا۔ "بے چارہ جونی میری ویدر چل بسا۔"

"مرحوم کی عمر سترّ برس تھی۔" اس نے بتایا۔

لائنل نے اپنے دوست کے کان میں کہا۔ "مرحوم کی عمر سترّ برس تھی۔"

"تیس سال سے خوانچہ لگاتا تھا۔ مکئی کے بھنے ہوئے دانے بیچتا تھا۔"

لائنل نے دہرایا۔ "بیس سال سے خوانچہ لگاتا تھا۔" پھر اچانک چلا کر بولا۔

"وہی تو نہیں جو چوک میں گرم دانے بیچتا تھا؟"

"ہاں وہی۔ آج بیچارہ اپنے خالق سے جاملا۔"

"اسے تو میں جانتا تھا اکثر اس سے دانے خریدتا تھا۔ کیسے انتقال ہوا؟"

"بے چارہ سوتے سوتے چل بسا۔ اپنے خالق کے پاس چلا گیا۔"

لائنل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "جونی میرا واقف تھا۔ میں پہلے اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ میرا دوست تھا۔"

اس نے یولی سیز کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میرا دوست چل بسا۔ اپنے مالک سے جاملا۔“

جنازہ آگے نکل گیا اور گرجے کے سامنے صرف دو بچّے رہ گئے۔

لائنل کو اپنا دوست یاد آرہا تھا جو اسے بھُنے ہوئے مزید ار دانے دیا کرتا تھا۔ اس کے قدم بوجھل ہو گئے۔ وہ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔

دونوں لائبریری کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ اس سادہ مگر صاف ستھری عمارت میں داخل ہوئے تو چاروں طرف دہشت انگیز سکوت طاری تھا۔ دیواریں، فرش، الماریاں، میزیں، ہر چیز پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ بوڑھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ چند مقامی فلاسفر ضخیم کتابیں لیے بیٹھے تھے۔ تین چار طلباء ریسرچ میں مشغول تھے۔ مگر علم کے یہ سب متلاشی خاموش تھے۔ لائنل ماحول سے اتنا متاثر ہوا کہ مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

پنجوں کے بل چل رہا تھا۔ اس پر مطالعہ کرنے والوں سے زیادہ کتابوں کا رُعب پڑا۔ یولی سیز بھی بڑے احتیاط سے قدم اُٹھاتا کہ آہٹ نہ ہو۔ لائنل کتابوں کو دیکھ رہا تھا اور یولی سیز پڑھنے والوں کے چہرے۔

لائنل اَن پڑھ تھا پھر بھی کتابوں کا شوق اسے کھینچ لایا۔ وہ سرگوشیوں میں اپنے

دوست کو بتارہا تھا۔ ”دیکھو تو سہی۔ کتنی ساری کتابیں ہیں۔ یہ سرخ کتاب ہے۔ یہ سبز اور وہ نیلی۔“

بوڑھی لائبریرین نے دیکھا کہ دو بچّے منہ اٹھائے اِدھر اُدھر پھِر رہے ہیں۔ سرگوشی کرنے کی بجائے وہ زور زور سے باتیں کرنے لگی۔ لائبریری کی اس طرح توہین ہوتے دیکھ کر لائنل کو بہت افسوس ہوا۔

”لڑکو کیا چاہیے؟“ بوڑھی نے پوچھا۔

”جی کتابیں۔“ لائنل نے جواب دیا۔

”کون سی کتاب۔“

”سب کی سب۔“

”یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایک کارڈ پر چار کتابوں سے زیادہ نہیں دی جا سکتیں۔“

”میں کتابیں مانگتے تو نہیں آیا۔“

”تو پھر کس لیے آئے ہو؟“

”کتابیں دیکھنے آیا ہوں۔“

"کتابیں پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ دُور سے دیکھنے کے لیے نہیں۔"

"دیکھنے کی اجازت نہیں ہے کیا؟"

"ممانعت بھی نہیں ہے۔ اور یہ کون ہے؟"

"یہ یولی سیز ہے۔ غریب پڑھ نہیں سکتا۔"

"اور تم؟"

"میں اَن پڑھ ہوں، لیکن یہ بھی اَن پڑھ ہے، اسی لیے ہماری دوستی قائم ہے۔ میرے کئی ساتھی پڑھے لکھے ہیں دوست صرف یہی ہے۔"

بوڑھی نے غور سے دونوں کو دیکھا۔ "چلو کیا ہوا جو اَن پڑھ ہو۔ میں پڑھی لکھی ہوں۔ گزشتہ ساٹھ سال سے کتابیں پڑھ رہی ہوں۔ کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ کتابیں دیکھنا چاہتے ہو جاؤ دیکھ لو۔"

"جی بہت اچھا۔"

دونوں دوست ایسی دنیا میں پہنچ گئے جو بے حد پر اسرار تھی۔

"یولی سیز دیکھو یہ سب کتابیں ہیں۔ پتا نہیں ان میں کیا کچھ لکھا ہے۔ کیسے کیسے

خزانے ان میں پوشیدہ ہیں۔ یہ سبز رنگ کی کتاب کتنی خوش نما ہے۔ نئی، چمکیلی اور حسین۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کتاب اٹھائی اور صفحے پلٹنے لگا۔ "دیکھا۔ اس میں بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ یہ الف ہے۔ یہ دوسرا الف ہے۔ یہ کوئی اور حرف ہے۔ یہ بھی ضرور کوئی حرف ہو گا۔ سب کے سب مختلف ہیں۔"

لائنل نے لمبا سا سانس لیا۔ "کبھی تجھے بھی پڑھنا آئے گا؟ بڑا جی چاہتا ہے کہ یہ حروف، الفاظ، فقرے پڑھوں۔ یہ تصویر دیکھی۔ کتنی حسین لڑکی ہے۔"

وہ ورق گردانی کرتا رہا۔ "ساری کتاب میں فقرے ہی فقرے ہیں۔ ضرور ان کا کوئی مطلب ہو گا۔ خوب ہے یہ جگہ۔ جدھر دیکھو کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ لیکن پڑھنا نہ آتا ہو تو علم کا یہ خزانہ نرا گدھے کا بوجھ ہے۔ ہم دونوں اَن پڑھ ہیں۔ چلو گھر۔"

اس نے کتاب واپس رکھ دی۔ دونوں دوست پنجوں کے بل چلتے ہوئے لائبریری سے نکل آئے۔

یولی سیز خوش تھا کہ آج ایک نئی چیز دیکھ لی۔

لیکچر کلب میں

لیکچر کلب کے سامنے ہومر نے سائیکل روک لی۔ دن کے ڈھائی بجے تھے۔ لیکچر شروع ہونے والا تھا۔ ادھیڑ عمر کی فربہ خواتین جن میں زیادہ تعداد ماؤں کی تھی کلب میں داخل ہو رہی تھیں۔ ہومر نے لفافہ نکال کر پڑھا۔ روز الی سمز پیباڈی، لیکچر کلب اتھیکا۔

کلب کی صدر جو پچاس کے لگ بھگ بھاری بھرکم خاتون تھیں۔ سٹیج پر کھڑی ہوئی مقرر کا تعارف کرا رہی تھیں۔ لیکن مقرر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بار بار یہ میز پر مکا مار کر سامعین کو خاموش رہنے کی تلقین کرتیں۔

ہومر کو جھانکتے دیکھ کر ایک خاتون آ گئیں۔

”روزالی سمز پیباڈی کے لیے تار لایا ہوں۔ ہدایات کے مطابق لفافہ کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔“

”پیباڈی نہیں پیٹی۔“ اس نے تصحیح کی۔ ”وہ تار کا انتظار کر رہی ہیں۔ جب وہ سٹیج پر

آئیں تب دینا۔"

"وہ کب آئیں گی؟"

"آنے والی ہیں۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ جب آئیں تو زور سے کہنا۔ روز الی سمز پیٹی کا تار آیا ہے۔ کہیں پیباڈی نہ کہہ دینا۔"

"بہت اچھا۔"

ہومر کرسی پر بیٹھ گیا۔

صدر کی تعارفی تقریب جاری تھی۔ "سامعین، ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ آج ہمارے ہاں روز الی سمز پیٹی تشریف لائی ہیں۔"

صدر کو تالیوں کا انتظار تھا اس لیے خاموش ہو گئی۔ جب تالیاں بج چکیں تو بولی۔ "زمانۂ حاضرہ کی اس سب سے ممتاز خاتون کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ان کا نام اور کارنامے بچّے بچّے کی زبان پر ہیں۔ شاید آپ جاننا چاہیں کہ انہیں یہ مقبولیت کیونکر حاصل ہے۔ یہ بہت طویل داستان ہے جو ہم عورتوں کے لیے بلا کی جاذبیت رکھتی ہے۔ اس میں کیا نہیں ہے۔ حسن و رومان، رنگ آمیزی، پُر خطر اور دہلا دینے والے واقعات۔ سبھی کچھ تو ہے پھر بھی سمز پیٹی ایک سادہ

طبیعت برطانوی حسینہ ہیں۔ اس خاموش سی لڑکی میں فولاد کی سی سختی اور اولوالعزم مردوں کی سی ہمّت ہے۔ بلکہ وہ بیشتر مردوں سے کہیں حوصلہ مند ہیں۔"

ایک عورت کے کارنامے بیان کرتے ہوئے صدر کے لہجے میں مایوسی اور حزن کی رمق آگئی تھی۔ "اور ہم عورتیں بیچاری کیا ہیں؟ کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ بچّوں کی پرورش پر عمر گزر گئی۔ لیکن سمز پیٹی ہمارے خوابوں کی تعبیر ہیں۔ ہم گھریلو مظلوم عورتوں کے خواب، خواب جو ہمیشہ ادھورے رہے۔ ہمیں ان کی شاندار زندگی پر رشک آتا ہے۔ کاش ہم بھی ایسی زندگی بسر کر سکتیں۔ لیکن قسمت کو یہ منظور نہ تھا۔ دنیا میں سمز پیٹی صرف ایک دفعہ پیدا ہوتی ہے۔" صدر نے باری باری سب کے چہروں کو دیکھا۔

"فخرِ نسواں، پیٹی کے کارنامے بیان کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ یہ فہرست بے حد طویل ہے۔ جو کارہائے نمایاں انہوں نے سرانجام دیئے وہ ناقابلِ یقین ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مصیبتوں اور آفتوں سے کوئی کیونکر بچ کر جا سکتا ہے۔ مگر سمز پیٹی اب تک زندہ ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک دن رومان سے لبریز ہوتا ہے۔ وہ جہاں جاتی ہیں مناسب ماحول اور حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے اتھیکا جیسی گمنام جگہ کے بھی

تذکرے ہونے لگیں گے۔ اب میں آپ کی سوانح عمری مختصراً بیان کروں گی۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک آپ محاذِ جنگ پر ایمبولینس چلاتی رہیں۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۸ء تک آپ نے ایک لڑکی کے ساتھ دنیا کی سیر کی۔ آپ کو پیدل چلنا پڑا، چھونپڑوں میں قیام کیا۔ کشتیوں میں، گھوڑوں پر، بیل گاڑیوں سے راستہ طے کیا۔ دنیا کے ستائیس ملک دیکھے۔ جب آپ چین میں کائنٹن سے ہاکو جارہی تھیں تو فوج نے پکڑ لیا۔ لیکن برسات آئی تو آپ دریائے سین میں کود کر فرار ہو گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں آپ شمالی افریقہ پہنچیں۔ مراکش سے حبش کا سفر کیا۔ ۱۹۲۰ء میں شام میں خفیہ پولیس میں ملازمت کی۔ دمشق میں شاہ فیصل سے ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے کفرہ کی سیاحت کا انتظام کرایا۔ یہ جگہ صحرائے لیبیا کے وسط میں ہے اور سنوسی قوم کا پایۂ تخت ہے۔ آپ نے مصری خاتون کے بھیس میں اونٹ پر ایک ہزار میل کی مسافت طے کی۔ آپ کے ہمراہ چند مقامی عورتیں تھیں جنہیں انگریزی کا ایک لفظ تک نہ آتا تھا۔ آپ کا یہ سفر تاریخی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے پہلے وہاں مغرب کے کسی سیّاح کا قدم نہیں پہنچا تھا۔"

ہومر دعائیں مانگ رہا تھا کہ کسی طرح تقریر ختم ہو۔

"۱۹۲۳ء میں سمز پیٹی نے بیس ٹن کی کشتی لے کر عرب جہاز رانوں کے ساتھ بحیرہ اسود کی سیر کی اور جیزان کی ممنوعہ بندرگاہ پر اُتریں۔ آپ عرب عورتوں

کے بھیس میں تھیں۔ ۱۹۲۵ء کوہ پیمائی میں گزرا۔ آپ نے کوہ اطلس کی چوٹیاں سر کیں۔ ۱۹۲۶ء میں ایک ہزار ایک سو میل پیدل چل کر حبش عبور کیا۔ غالباً یہ دنیا کا ریکارڈ ہے۔ کوئی ہمیں تو دیکھے ذرا پیدل چلنا پڑے تو تھک جاتے ہیں۔ کاش ہم ہر وقت پیدل چلا کریں۔"

اس پر حاضرین میں سے اکثر نے ناک بھوں چڑھائی۔

"صدر نے جلدی سے کاغذ کے پرزے کو پڑھا اور ۱۹۲۸ء میں آپ لندن کے ایک اخبار کی نامہ نگار خصوصی کی حیثیت سے بلقان میں تھیں اور مقامی عورتوں جیسا لباس پہنتی تھیں۔"

ہومر اُکتا چکا تھا۔ واپس تار گھر پہنچنے کی جلدی تھی اور ساتھ یہ جھنجلاہٹ کہ یہ عورت بار بار بھیس کیوں بدلتی تھی۔

"۱۹۳۰ء میں آپ نے ترکی کی سیر کی۔ مصطفی کمال سے ملاقات ہوئی۔ وہاں آپ ترک خواتین کے بھیس میں تھیں۔ اس کے بعد آپ نے نو ہزار میل کا سفر گھوڑے پر طے کر کے مشرقِ قریب کی سیاحت کی۔ آذربائیجان میں آپ نے اشتراکی فوج اور کوہ قاف کے دیہاتوں کی لڑائی ملاحظہ فرمائی۔ ۱۹۳۱ء میں آپ جنوبی امریکہ میں برازیل کے گھنے جنگلوں کا کھوج لگانے میں مصروف رہیں۔

آپ کے ہمراہ مقامی لوگ تھے۔ ان میں کوئی میکس بھی تھا۔ سمز پیٹی کے کارنامے گننے لگوں تو صبح ہو جائے۔ اور پھر یہ مجمع انہیں دیکھنے آیا ہے نہ کہ مجھے۔"

اس پر سب مسکرانے لگے۔ چند قہقہے بھی سنائی دیئے۔

"سامعین ایک یکتائے روزگار ہستی کا تعارف کرانے میں مجھے فخر محسوس ہوتا ہے۔ آیئے روزالی سمز پیٹی۔ سب آپ کے منتظر ہیں۔"

بڑے زور سے تالیاں بجیں۔ صدر سٹیج کے اس گوشے کی طرف بڑھی جہاں سے سمز پیٹی کو آنا تھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ تالیوں کا شور بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ حاضرین کی ہتھیلیاں دکھنے لگیں۔ آخر وہ عظیم خاتون سٹیج پر آئیں۔

ہومر کو جو چیز نظر آئی وہ عورت سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھی بلکہ اسے عورت کہنا سراسر زیادتی تھی۔ روزالی سمز پیٹی ایک چمرخ قسم کی سوکھی ہوئی طویل قامت چیز تھی۔ جس کے خدوخال مردانہ تھے اور چہرہ کسی قسم کے اظہار سے مُبرّا تھا۔

تار دینے کا وقت آ پہنچا تھا۔ ہومر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سٹیج پر چلے جاؤ۔" وہ خاتون جس نے ہدایات دی تھی، بولی۔

ہومر نے سٹیج پر پہنچ کر زور سے کہا۔ "روزالی سمز پیٹی کا تار آیا ہے۔"

"اچھا میرا تار ہے۔ سامعین مجھے معاف فرمائیے۔" اس نے دستخط کیے اور ہومر کی ہتھیلی میں دس سینٹ کا ایک سکہ تھما دیا۔

ہومر کو بہت بُرا لگا۔ لیکن لیکچر کلب میں اس نے ایسے ہونّق اور مضحکہ خیز نظارے دیکھ لیے تھے کہ تار دیتے ہی بھاگ گیا۔ تقریر شروع ہو چکی تھی۔

"۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہونے سے ذرا پہلے میں ایک خفیہ مشن کے سلسلے میں بویریہ میں تھی۔ میں نے دیہاتی لڑکی کا بھیس پہن رکھا تھا۔"

ہومر نے سڑک کے کنارے ہنری ولکنسن کو بیٹھے دیکھا جو تین سال پہلے ریل کے حادثے میں دونوں ٹانگیں کھو چکا تھا۔ بیچارہ ٹوپی سامنے رکھ کر پنسلیں بیچا کرتا تھا۔ ہومر نے نہ کبھی اس کی ٹوپی میں کچھ ڈالا نہ اس سے پنسل خریدی۔ سمز پیٹی والا سکہ اسے پریشان کر رہا تھا۔ چنانچہ ولکنسن کی ٹوپی میں وہ سکہ ڈال کر سائیکل پر سوار ہو گیا۔

تھوڑی دور گیا ہو گا کہ اسے اپنی اس حرکت پر ندامت ہونے لگی۔ واپس آیا۔

سائیکل ایک طرف پھینکی اور جیب سے آدھے ڈالر کا سکہ اپاہج کی ٹوپی میں ڈال دیا۔

مقدس کمرے

آدھ گھنٹے بعد ہومر نے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے سائیکل روکی۔ دروازے پر لکھا تھا۔ مقدس کمرے۔

بل کھاتے ہوئے زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اُوپر پہنچا۔ ایک بڑے سارے کمرے میں میز رکھی تھی۔ قریب ہی دیوار میں گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔

اس نے جیب سے لفافہ نکال کر پتہ پڑھا۔ تار ڈولی ہاتھورن کے نام تھا۔

کسی کمرے میں گراموفون بج رہا تھا اور دو عورتیں اور ایک مرد باتیں کر رہے تھے۔ ایک دروازہ کھلا، ادھیڑ عمر کا ایک مرد نکلا اور دوسرے دروازے میں کسی عورت سے باتیں کرنے لگا۔ ہومر کو عورت کا سر نظر آرہا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا اور مرد سیڑھیاں اُترنے لگا۔

ہومر نے گھنٹی بجائی۔ دروازہ جو ابھی بند ہوا تھا، کھلا اور نسوانی آواز سنائی دی۔

"ابھی آئی۔"

ایک نوعمر حسینہ باہر نکلی جس کے خدوخال بے حد دلکش تھے۔ یہ لڑکی میری یا بیس سے کچھ مختلف نہ تھی۔

"ڈولی ہاتھورن کا تار آیا ہے۔"

"وہ باہر گئی ہوئی ہے۔ میں دستخط کر دوں؟"

"کر دیجئے۔"

وہ ہومر کو عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"ذرا ٹھہرنا۔"

یہ کہہ کر وہ دوڑتی ہوئی ایک کمرے میں چلی گئی۔

اتنے میں ایک اور شخص زینہ عبور کر کے ہومر کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اسے گھورنے لگا۔ لڑکی باہر نکلی اور ہومر کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ عجیب سا تھا۔ اس میں ناخوشگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس بو سے ہومر نا آشنا تھا۔ لڑکی نے اسے ایک لفافہ دیا۔ "یہ بے حد ضروری ہے۔ اس میں نوٹ ہیں۔ میری بہن

کو ان کی سخت ضرورت ہے۔ میرے پاس ٹکٹ نہیں تھے ورنہ لگا دیتی۔ اسے ہوائی ڈاک کی رجسٹری سے بھیج دینا۔“

وہ خاموش ہو گئی تاکہ اتنی دیر میں ہومر معاملے کی اہمیت کو سمجھ لے۔

”اسے ڈاک میں ڈال دو گے نا؟“

نہ جانے کیوں ہومر کی طبیعت منغّض ہو گئی۔ جس روز وہ میکسیکی عورت کو اس کے بیٹے کے موت کی خبر سنانے گیا تھا۔ تب بھی یوں ہی محسوس ہوا تھا۔

”بہت اچھا۔ میں ابھی ڈاکخانے پہنچ کر ہوائی ڈاک سے رجسٹری کرا دوں گا۔ سیدھا وہیں جا رہا ہوں۔“

”یہ لو ڈالر۔ خط کو حفاظت سے ٹوپی میں رکھ لو۔ کسی کو دکھانا مت اور ذکر بھی مت کرنا۔“

”نہیں کروں گا۔ ابھی خط ڈال کر ریزگاری واپس لاتا ہوں۔“

”نہیں یہاں پر مت آنا۔ جلدی سے چلے جاؤ کوئی دیکھ نہ لے۔“

”بہت اچھا۔“

ہومر سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ لڑکی کسی مرد سے باتیں کرنے گی۔ زینے پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت کا سامنا ہوا۔ اس نے بڑھیا کپڑے اور بیش قیمت زیورات پہن رکھے تھے۔ لڑکے کو دیکھ کر وہ رُک گئی۔

''ڈولی ہاتھورن کا تار لائے تھے؟'' اس نے مُسکرا کر پوچھا۔

''جی ہاں۔ تار اوپر رکھا ہے۔''

''میرا تار تھا۔ شاباش۔'' اس نے ہومر کو غور سے دیکھا۔ ''تم نئے ہرکارے ہو؟ میں ویسٹرن یونین اور ڈاک خانے کے سب ہرکاروں کو جانتی ہوں۔ بہت اچھے لڑکے ہیں۔ مجھ پر تو خاص طور پر مہربان ہیں۔ میں بھی ان کا خیال رکھتی ہوں۔''

عورت بٹوہ کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگی۔ بٹوے میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

''یہ لو۔'' اس نے ہومر کو بیس پچیس ملاقاتی کارڈ دیئے۔

''یہ کس لیے ہیں؟''

''تم جگہ جگہ تار لے جاتے ہو۔ شراب خانوں اور اسی قسم کی دوسری جگھوں پر جایا کرو تو کارڈ چھوڑ آیا کرو۔ کہیں سیّاح مل جائیں یا جہاز راں اور سپاہی ہوں

جنہیں رات بسر کرنے کے لیے کمرے کی ضرورت ہو تو انہیں کارڈ دے دینا۔ جنگ چھڑی ہوئی ہے اور سپاہیوں کی خاطر تواضع کرنا ہمارا فرض ہے۔ مجھے علم ہے کہ سپاہی بیچارے کتنے اداس ہوتے ہیں۔ نہ زندگی کا پتہ نہ موت کا۔"

"جی اچھا۔"

ہومر سیڑھیاں اُترنے لگا اور ڈولی ہاتھون مقدس کمروں میں چلی گئی۔

مسٹر میکانو

لائبریری سے نکل کر لائنل اور یولی سیز دیر تک گلی کوچوں میں پھرتے رہے۔ شام ہو چکی تھی۔ ایک دکان کے سامنے ہجوم دیکھ کر وہ رک گئے۔ کھڑکی میں ایک آدمی کھڑا طرح طرح کی حرکتیں کر رہا تھا۔ وہ جیتے جاگتے انسان کی جگہ موم کا بنا ہوا پُتلا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے زندہ لاش ہاتھ پاؤں ہلا رہی ہو۔ اس شعبدہ بازی کا مقصد ڈاکٹر بریڈ فورڈ کے ٹانک کی تشہیر تھی۔ کھڑکی پر لکھا تھا۔

”مسٹر میکانو۔ نصف مشین اور نصف انسان۔ جو زندہ کم ہے اور مُردہ زیادہ۔ پچاس ڈالر کا انعام اسے ملے گا جو مسٹر میکانو کو مسکرانے پر مجبور کر دے گا۔ ہنسانے کے لیے پانچ سو ڈالر۔“

آدمی کے سامنے ایک میز تھی جس پر چھوٹی چھوٹی تختیاں پڑی تھیں۔ جن پر دوا کی تعریفیں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ تختی اُٹھاتا، چھڑی سے عبارت کی طرف اشارہ کر کے تختی رکھ دیتا اور دوسری اُٹھالیتا۔ پھر تیسری، چوتھی۔ تختیاں ختم ہونے

پر پھر یہ عمل دہرایا جاتا۔ یہ تو زندہ ہے۔ لائنل نے یولی سیز سے کہا۔ ”میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ یہ مشین نہیں۔ ذرا ان کی آنکھیں تو دیکھو۔“

پُتلے نے ہجوم کے سامنے ایک تختی کر دی، جس پر لکھا تھا۔

”زندگی سے مایوس ہونا کفر ہے۔ قسمت کو کوسنے کی بجائے ڈاکٹر بریڈ فورڈ کا ٹانک استعمال کیجئے اور خُدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے۔“

اس کے بعد ایک اور تختی آئی لیکن لائنل پُتلے کی شکل سے بیزار ہو چلا تھا۔

”آؤ گھر چلیں، ساری تختیاں تین مرتبہ دیکھ چکے ہیں۔ دیر بھی ہو گئی ہے۔“

لیکن یولی سیز نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”چلو چلیں، مجھے بھوک لگی ہے۔“ لائنل نے پھر کہا۔

یولی سیز نے اس کی بات اَن سُنی کر دی۔

”اچھا تو پھر میں چلتا ہوں۔“

یولی سیز پر اس دھمکی کا بھی اثر نہ ہوا۔ لائنل دوست کی لاپروائی پر حیران ہو گیا۔ افسوس بھی ہوا۔ پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا گیا کہ شاید یولی سیز باز آ جائے لیکن اسے تو

کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔

"اور میں اسے اپنا بہترین دوست سمجھتا ہوں۔" لائنل بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ مجمع منتشر ہونے لگا۔ حتیٰ کہ صرف دو تماشائی رہ گئے۔ یولی سیز اور ایک بوڑھا۔ آخر بوڑھا بھی چلا گیا۔

رات ہو چکی تھی، تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ پُتلا تختیاں دکھا رہا تھا اور بچّہ بُت بنا کھڑا تھا۔ یکایک یولی سیز نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پہلی مرتبہ اسے تاریکی اور تنہائی کا احساس ہوا۔ دفعتاً اسے ایسا معلوم ہوا جیسے سامنے موت کھڑی ہے۔ پتلا اسے گھور رہا تھا۔ بچّے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سرپٹ بھاگا۔ اسے چند راہ گیر ملے۔ لیکن وہ بھی موت کی طرح بھیانک معلوم ہوئے۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ لیکن وہ روتا ہوا بھاگتا جا رہا تھا۔

اس سے پہلے وہ کبھی نہیں ڈرا تھا۔ لیکن پُتلے نے ایسا خوفزدہ کیا کہ جیسے اس کی جان کھینچ لی ہو۔ وہ چلّانے لگا۔ "ابّا۔ امّی۔ مجھے بچاؤ۔ مارکس، بیس، ہومر بچاؤ۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرار ہو کر کہاں جائے۔ کبھی ایک سمت میں بھاگنے لگتا، کبھی دوسری سمت میں۔ بس یہی دُھن تھی کہ کسی طرح اپنے عزیزوں کے پاس پہنچ جائے۔

اچانک اسے آگی نظر آگیا جو چلّا چلّا کر اہم خبروں کی سرخیاں خالی سڑک کو سُنا رہا تھا۔ آگی کو اس طرح چلّانے سے سخت نفرت تھی۔ ایک تو اس لیے کہ تقریباً ساری خبریں قتل و خون کے متعلق ہوا کرتیں۔ دوسرے یہ کہ بازاروں میں کھڑے ہو کر چنگھاڑنے سے اسے چِڑ تھی۔ اس کی عادت تھی کہ سڑک پر رونق ہوتی تو چُپ رہتا لیکن جو نہی بازار خالی ہوتا وہ دن بھر کی منحوس خبریں زور زور سے سُنانے لگتا۔

وہ اکثر سوچتا کہ اخبار بیچنا کس قدر بیہودہ کام ہے۔ لوگ غلطیاں کرتے ہیں، شرارتیں کرتے ہیں اور میں یوں جی لگا کر تشہیر کرتا ہوں جیسے بڑی خوشخبریاں سُنا رہا ہوں۔ اُدھر سننے والوں پر دوسروں کی کمینی حرکتوں اور جرائم کا اتنا سا اثر بھی نہیں ہوتا۔ سب یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

کبھی کبھی اسے خواب میں نظر آتا کہ وہ اہم سرخیاں سُنا رہا ہے اور دل ہی دل میں ان سب مجرموں اور لفنگوں کو کوس رہا ہے جو ان خبروں کے ذمہ دار تھے اور جیسے آگی کی گونج دار آواز سُنتے ہی چور، ڈاکو، رہزن سب کچھ چھوڑ کر خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خواب میں آگی انہیں خوب ڈانٹا۔ بے ایمانو، شیطانو، باز آجاؤ۔ گناہوں سے توبہ کر ڈالو اور اچھے اچھے کام کیا کرو۔ جاؤ جا کر درخت بوؤ۔ آگی کے خیال میں درخت بونا ثواب کا کام تھا۔

آگی کو دیکھ کر یولی سیز کی ڈھارس بندھ گئی۔ وہ آگی کو بُلانا چاہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود آواز نہ نکل سکی۔ وہ تیزی سے بھاگا اور آگی سے چمٹ گیا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے ننھے۔ رو کیوں رہے ہو؟"

لیکن بچّے کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"تم ڈر گئے ہو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ شاباش روؤ مت۔"

یولی سیز ضبط کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس کی سسکیاں نہ تھمتی تھیں۔

"اچھا چلو ہومر کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہومر کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہومر کے پاس؟" بھائی کا نام سُن کر مسکرانے لگا۔

"ہاں تار گھر کے قریب ہی ہے چلو۔"

دونوں تار گھر پہنچے۔ ہومر کام میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر یولی سیز کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے گھر پہنچ گیا ہو۔

ہومر نے اسے گود میں اٹھایا۔ "کیا ہوا؟ اتنی رات گئے ننھا یہاں کیا کر رہا ہے؟"

”یہ کھو گیا تھا اور رو رہا تھا۔ ابھی ابھی چُپ ہوا ہے۔“ آگی نے بتایا۔

بچّے نے سسکی لی۔ ہومر اسے پیار کرنے لگا۔ ”ننھے روؤ مت۔ ابھی گھر چلتے ہیں۔“ سپنگلز اور گروگن کام چھوڑ کر لڑکوں کو دیکھنے لگے۔

”آگی اچھا کیا جو اسے لے آئے ورنہ بڑی دقّت ہوتی۔“

”ہلو، آگی! ایک اخبار تو دو۔“

آگی نے بڑی صفائی سے اخبار تہہ کر کے سپنگلز کو دیا۔ اس نے جلدی سے سرخیاں دیکھ کر ردی میں پھینک دیا۔

”کاروبار کا کیا حال ہے؟“ سپنگلز نے پوچھا۔

”خاصا ہے۔ ہفتے کے دن عموماً پچھتّر سینٹ کما لیتا ہوں۔ لیکن آج نہ جانے لوگ کہاں چھپ گئے ہیں۔ امید تو ہے کہ گھنٹے دو گھنٹے میں سارے اخبار بِک جائیں گے۔ کھانے کے بعد لوگ سینما دیکھنے نکلتے ہیں۔“

”سینما دیکھنے والوں کی ایسی تیسی۔ یہ قیمت لو اور اخباروں کا پلندہ یہاں رکھ دو۔“ سپنگلز نے کہا۔

آگی خوش تو ہوا لیکن سوچنے لگا کہ اخبار اس طرح تو نہیں بکتے۔ فی خریدار فقط ایک اخبار ہوا کرتا ہے اور اس کے لیے بھی کافی چیخنا چنگھاڑنا پڑتا ہے۔ وہ تھکا ہوا تھا؟ بھوکا تھا اور جانتا تھا کہ سپنگلز نہایت رحم دل انسان ہے۔ بازاروں اور سڑکوں پر کافی ہونّق لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ سپنگلز جیسے بھلے مانس سے نفع کمانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

"جی میں آپ سے نفع نہیں لوں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ اخبار مجھے دو اور گھر چلے جاؤ۔"

"بہت اچھا جناب۔ کبھی کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بلا لیجئے۔"

"اچھا۔" سپنگلز نے اخبار ردی میں ڈال دیئے۔

"جی! یولی سیز کھو گیا تھا۔" آگی بولا۔

"خیر مل تو گیا نا۔ ننھے میاں کیسے ہو؟" سپنگلز یولی سیز سے مخاطب ہوا۔

یولی سیز سوچنے لگا کہ کیا جواب ہے۔

"کہہ دو اچھا ہوں۔" ہومر نے لقمہ دینے کی کوشش کی۔

سب خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک سپنگلز تھا جو مسرور تھا۔ باقی سب سہمے ہوئے سے تھے۔

گروگن اُٹھا، بوتل نکال کر پانچ چھ گھونٹ لیے اور واپس آ بیٹھا۔

آگی جانے لگا تو ہومر نے روک لیا۔ ”ابھی مت جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ مسٹر سپنگلز مجھے راستے میں کام ہے۔ ان دونوں کو اُتار کر کام پر چلا جاؤں گا۔“

”ضرور۔“ سپنگلز نے اپنی میز سے اُبلا ہوا انڈا اُٹھا لیا جسے وہ خوش نصیبی کی علامت سمجھتا تھا، یا کم از کم جو بد نصیبی کو دُور رکھتا تھا۔

”دونوں کو سائیکل پر کیسے بٹھاؤ گے۔ میرے خیال میں مجھے پیدل جانا چاہیے۔“ آگی بولا۔

”دیر ہو چکی ہے اور تمہارا گھر تین میل ہے۔ تم پیچھے بیٹھ جانا۔ یولی سیز آگے بیٹھ جائے گا۔ آسانی سے پہنچ جائیں گے۔ آؤ چلیں۔“

آگے کچی سڑک تھی۔ ہومر کی ٹانگ میں درد تھا۔ لیکن وہ دونوں سواریوں کو کھینچ رہا تھا۔ ایرا کی دکان کے ساتھ ہی آگی کا گھر تھا ہومر نے اسے اتار دیا۔ دکان کے دروازے میں ایرا اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑے آسمان کی طرف دیکھ رہا

تھا۔ سامنے میدان تھا اور دوسری طرف اخروٹ کے درخت کے نیچے مسز میکالے رسی سے خشک کپڑے اتار رہی تھی۔ گھر میں سے بیس اور میری کے گانے کی مدہم آواز آرہی تھی۔

ہومر آسمان کی طرف دیکھنے لگا جسے ایرا اور اس کا بیٹا غور سے تک رہے تھے۔ آگی گھر سے نکلا اور ایرا سے باتیں کرنے لگا۔

"مسٹر ایرا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

"خدا کا شکر ہے۔"

"آج میرے پاس پچھتر سینٹ ہیں۔ بہت سی چیزیں لوں گا۔"

"اندر آجاؤ۔"

دُکان میں جانے سے پہلے ایرا نے بیٹے کو آسمان میں تیرتے ہوئے بادل دکھائے۔

"وہ دیکھو جان، اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ اب سونے کا وقت قریب ہے۔ رات بھر سو کر جب اُٹھیں گے تو نیا دن طلوع ہو چکا ہو گا۔ سمجھے؟"

آگی اور باپ بیٹا دُکان میں چلے گئے۔ ہومر نے گھر کا رخ کیا۔

"وہ رہیں امّی۔" یولی سیز بولا۔

"ہاں۔ اخروٹ کے درخت کے پیچھے کھڑی ہیں۔"

گھر پہنچ کر یولی سیز کا چہرہ دمک اٹھا۔ ہومر نے سائیکل روکی اور بھائی کو اُتار دیا۔

"امّی یولی سیز کھو گیا تھا۔ آگی کو مل گیا وہ اسے تار گھر لے گیا۔ میں جلدی سے آپ اور میری سے مل آؤں۔ پھر کام پر جانا ہے۔"

لڑکیاں گا رہی تھیں۔ ہومر اندھیرے میں کھڑا سُنتا رہا۔ گیت ختم ہوا تو اندر چلا گیا۔

"ہومر آج مارکس کا خط آیا ہے۔" میری نے فرطِ مسرّت سے مغلوب ہو کر کہا۔

"اچھا! کیسے ہیں بھائی جان؟"

"خیریت سے ہیں۔ ان کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں کہاں۔ لکھا ہے کہ اگر کچھ دن خط نہ آئے تو فکر نہ کرنا۔"

"سب کے نام خط آئے ہیں۔ امّی کے نام، میرے نام، یہاں تک کہ یولی سیز کو بھی خط لکھا ہے۔" بیس بولی۔

ہومر سوچنے لگا کہ شاید مجھے بھی لکھا ہو۔ لیکن اگر خط نہ ہوا تو پھر مایوسی اور شرمندگی ہوگی۔ آیا ہوتا تو لڑکیاں ضرور بتا دیتیں۔

آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ "میرے نام بھی ہے؟"

"ہاں ہاں تمہارے نام بھی ہے۔ بلکہ تمہارا لفافہ تو سب سے وزنی ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بھائی خط لکھتے ہیں تو ہم سب کو بھیجتے ہیں۔"

بیس گئی اور لفافہ اُٹھالائی۔

"اسے کھول کر ہمیں بھی سُناؤ۔" بیس بولی۔

"نہیں آپا مجھے دفتر پہنچنا ہے۔ فرصت میں پڑھوں گا۔"

"آج دن بھر ہم دونوں ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھرا کیے، لیکن کچھ نہ بنا۔" بیس نے کہا۔

"دن کبھی اتنا بُرا ابھی نہیں گزرا، طرح طرح کے تماشے دیکھے۔" میری بولی۔

"نوکری نہ ملنے پر مجھے تو خوشی ہوتی ہے۔ بھلا آپ ملازمت کیوں کریں؟"

"میں کما کر لاؤں گا۔ اِدھر میری کے ابّا اچھی جگہ لگے ہوئے ہیں۔ پھر کبھی

کوشش مت کیجئے۔"

"ہومر تم نہیں جانتے۔ ہمیں کام کرنا پڑے گا۔ امید تو ہے کہ جلد ہی کوئی جگہ مل جائے گی۔ ہمیں دوبارہ آنے کو کہا گیا ہے۔"

"نہیں آپا، میں اس کے خلاف ہوں۔ مرد موجود ہوں تو لڑکیاں محنت مشقت کیوں کریں۔ لڑکیوں کو چاہیے کہ گھر میں رہیں اور اس کی دیکھ بھال کریں۔ ہر وقت مُسکراتی رہیں کہ مرد تھکے ہارے لوٹیں تو دمکتے ہوئے حسین چہرے دیکھ کر ساری تکان دور ہو جائے۔ آپ کے فرائض بس اتنے ہی ہیں۔ بھائی مارکس واپس آکر میری کو ملازمت تھوڑا ہی کرنے دیں گے۔ چھوٹا سا گھر بنا کر دونوں علیحدہ رہا کریں گے۔ اور آپ، آپ کی بھی شادی ہو جائے گی۔ آپ اسی کو ملازمت سمجھ لیجئے اور اس کا انتظار کیجئے۔ مانا کہ جنگ ہو رہی ہے اور سب کام رُکے پڑے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دنیا سے اُمید اُٹھ گئی ہے۔ آپ دونوں بس گھر میں رہا کریں۔ میری اپنے ابّا کا ہاتھ بٹائے اور آپ امّی کا۔"

ہومر کو بڑوں کی طرح حکم چلاتے دکھ کر بیس کو فخر محسوس ہونے لگا۔ چھوٹا بھائی بچّہ نہیں رہا۔ اسے اب کُنبے کا فکر رہتا ہے۔

"اچھا اب ایک گیت سنائیے۔"

”کون سا گیت سنو گے؟“

”کوئی سا سُنا دو۔“

بیس پیانو بجانے لگی، میری نے گانا شروع کیا۔ گیت ابھی ادھورا ہی تھا کہ ہومر چپکے سے باہر نکل آیا۔ یولی سیز ایک انڈہ تھامے ڈربے کے پاس کھڑا تھا۔

”امّی۔ کل ہم سب گرجے میں جائیں گے۔ میری کو بھی لے چلیں گے۔“ ہومر نے کہا۔

”ہم تو ہر اتوار کو جاتے ہیں۔ میری بھی ساتھ ہوتی ہے۔“

”لیکن کل ضرور چلیں گے۔ میری بھی چلے گی۔“

ماں مسکرانے لگی۔

”ننھے، تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

”انڈا۔“ بچّے نے اس طرح کہا جیسے کسی مقدس چیز کا نام لے رہا ہو۔

ہومر سائیکل پر سوار ہوا اور کام پر چلا گیا۔

مضبوط بازوؤں کا سہارا

جب ہومر سائیکل پر سوار جا رہا تھا تو اس وقت بہت دور ایک ٹرین رات کی تاریکی میں تیزی سے جا رہی تھی۔ گاڑی امریکن لڑکوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں مارکس بھی تھا اور اس کا دوست ٹونی جارج بھی۔ سب نے فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کی آنکھوں، چہرے کے اظہار، قہقہوں اور گانے میں بلا کی زندگی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ صرف فوج ہی نہ تھی پوری قوم تھی۔

وہ قواعد، ضبطِ نفس اور فنِ حرب و ضرب کی چالیں سیکھ کر مشین بن چکے تھے، لیکن یہ نہیں بھولے تھے کہ وہ انسان ہیں۔ ان کے شور و غل میں بھی وقار جھلکتا تھا۔ انہیں خطرے کا احساس ضرور تھا مگر وہ نڈر بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ محاذ پر جا رہے ہیں لیکن انہیں بلا وجہ نہیں بھیجا جا رہا تھا۔ وہ سپاہی کے کام سے بھی واقف تھے۔ چند ایک کی عمر چالیس سے اوپر تھی ورنہ زیادہ تعداد نو عمر لڑکوں کی تھی۔ لڑکے جو گاؤں سے آئے تھے۔ شہروں سے آئے تھے۔ کھیتوں اور دفتروں سے آئے تھے۔ امیروں کے لڑکے غریبوں کے لڑکے۔

اس عجیب سے ماحول میں جہاں ہیجان تھا، افراتفری تھی، قہقہے تھے، بے خبری تھی، تدبیر اور سنجیدگی تھی۔ وہاں ایک گوشے میں مارکس اور اس کا دوست ٹوبی جارج محوِ گفتگو تھے۔

"ہم محاذ پر جا رہے ہیں۔"

"ہاں"

"مارکس میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ جنگ نہ ہوتی تو تم سے کبھی نہ مِل سکتا، نہ تمہارے کُنبے کے متعلق سُن پاتا۔"

"ہاں ٹوبی میں بھی یہی سوچتا رہتا ہوں۔"

مارکس خاموش ہو گیا۔ شاید وہ نامعلوم خطرے کی دہشت تھی۔

اس نے ٹوبی سے ایک اہم سوال پوچھا۔

"یہ بتاؤ تم موت سے ڈرتے ہو یا نہیں؟"

اس سوال کا جواب آسان نہ تھا۔ ٹوبی سوچ میں پڑ گیا۔

"اگر یہ کہوں کہ نہیں ڈرتا تو سراسر جھوٹ ہو گا۔ مارکس میں خوفزدہ ہوں اور

تم؟"

"میرے ذہن میں بھی ہر وقت یہی خیال رہتا ہے۔ اچھا بتاؤ کہ زندہ لوٹ آئے تو پھر۔"

"واپس آنے کی خوشی تو ہوگی لیکن میرا کوئی گھر بار نہیں ہے۔ تمہاری طرح عزیز واقارب نہیں ہیں جن کا چاؤ ہو۔ نہ کوئی لڑکی میرا انتظار کر رہی ہے، جیسے تمہاری محبوبہ تمہاری منتظر ہے۔ پھر بھی لوٹ آنے کی خوشی ضرور ہوگی۔"

دیر تک دونوں چُپ رہے۔ آخر مارکس نے پوچھا۔ "تمہیں موسیقی کیوں پسند ہے؟"

"بس یونہی پسند ہے۔"

ٹرین تیزی سے جارہی تھی۔ ڈبّے میں شور مچا ہوا تھا۔

"تم نے اپنے متعلق نہیں بتایا؟" ٹوبی بولا۔

"مجھے ان دنوں ابّا مرحوم بہت یاد آتے ہیں۔ امّی بھی یاد آتی ہے۔ بہن بیس، دونوں چھوٹے بھائی، میری اور اس کے والد۔ سب یاد آتے ہیں۔ سارے پڑوسی، ایرا کی دکان، ریل کی پٹڑی، سکول، گرجا گھر، لائبریری، اپنے استاد اور

لڑکپن کے وہ سب ساتھی جن میں سے کئی سدھار چکے ہیں۔ جن کی موت جنگ نہ تھی۔ بیماریاں اور حادثے تھے۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اتھیکا میرا اپنا قصبہ ہو۔ مارکس! اگر خیریت رہی تو مجھے اتھیکا لے چلو گے؟ میں وہ سب جگہیں دیکھوں گا جو تمھیں اس قدر عزیز ہیں۔"

"ضرور لے چلوں گا تمھیں۔ اپنے عزیزوں سے بھی ملاؤں گا۔ ہم غریب ہیں، غربت نے کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میرے ابّا بہت اچھّے آدمی تھے، اگرچہ وہ زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ انہوں نے کبھی روپیہ جمع نہیں کیا نہ کچھ چھوڑا۔"

"ان کا نام متیھو میکالے تھا نا؟"

"ہاں وہ باغیوں اور دکانوں پر کام کیا کرتے تھے۔ سیدھی سادھی محنت مشقت۔ دیکھنے میں وہ اور آدمیوں سے مختلف نہیں تھے۔ لیکن بڑے عظیم انسان تھے۔ انہیں ہر وقت کُنبے کا خیال ہوتا تھا۔ کنبہ انہیں بے حد عزیز تھا۔ سِکّے بچا بچا کر انہوں نے ہمارے لیے رباب خریدا۔ اب ان دنوں کس کے ہاں ہوتا ہے؟ لیکن انہوں نے لیے دیا۔ قیمت کی ادائیگی میں انہیں پانچ برس لگے۔ اتنا بڑھیا رباب میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ پھر وہ بہن کے لیے پیانو لائے۔ مدّتوں میں

یہی سمجھتا رہا کہ دنیا میں سب آدمی ابّا جیسے نیک نفس اور محبت والے ہوں گے۔ لیکن یہ غلط فہمی تھی۔ لوگ بُرے بھی نہیں ہیں، لیکن ان میں وہ عظمت مفقود ہے جو ابّا میں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میں لوگوں کو پہچانتا نہیں۔ ان کی خوبیاں نہیں دیکھ سکتا۔ بہت سے انسان اچھے ہوتے ہیں مگر انہیں کوئی سمجھتا نہیں۔"

"کاش میں ان سے ملا ہوتا۔ وہ میرے والد نہ تھے پھر بھی انہیں جاننے کا فخر تو حاصل ہو جاتا۔ میں اپنے والد کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ پتا نہیں وہ کون تھے کیسے تھے۔ یا شاید اس میں بہتری ہو۔ کیوں کہ کبھی کبھی یگانگت مایوس کن بھی ہو سکتی ہے۔ ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو تن تنہا پایا۔ سکول پہنچ کر سُنا کہ بچوں کے والدین بھی ہوتے ہیں جو انہیں پیار کرتے ہیں۔ میں اس پیار سے سدا محروم رہا۔ میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ دنیا میں ہر انسان اکیلا ہے۔ تبھی تنہائی کا اتنی جلدی عادی ہو گیا۔ جب مجھے پتا چلا کہ میں یتیم ہوں تو احساسِ غم بڑھتا گیا۔ شاید اسی لیے مجھے موسیقی پسند ہے۔ گیت احساسِ تنہائی کو کس قدر شدید کر دیتے ہیں۔ مارکس! ایک بات پوچھوں؟ بیس کیسی لڑکی ہے۔"

مارکس جانتا تھا کہ ٹوبی بے حد شرمیلا ہے اور جھجک جھجک کر اس نے یہ پوچھا ہے۔

"شرماؤ مت ٹوبی۔ جو چاہو پوچھ لو۔ میری بہن بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ہم گھر جائیں گے تو تم خود دیکھ لوگے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں پسند کرے گی۔"

"مجھے۔"

"ہاں۔ مجھے یونہی یقین سا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگوگے۔ ایسا ہوا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

بہن اور دوست کے متعلق باتیں کرتے ہوئے مارکس بھی ہچکچا رہا تھا۔ اسے دونوں عزیز تھے۔

پھر بھی یہ جھجک فطری تھی لیکن دوستی کا خلوص غالب آگیا۔

"ٹوبی تم اس سے شادی کر لینا۔ اتھیکا میں گھر بنا لینا۔ بڑا اچھا قصبہ ہے۔ لوگ بہت اچھے ہیں۔ تم وہاں خوش رہو گے۔ تو تمہیں بیس کی تصویر دیتا ہوں۔ اسے حفاظت سے رکھنا جیسے میری کی تصویر ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے۔"

ٹوبی نے دوست کی بہن کی شبیہ دیکھی۔ تصویر دیکھتا رہا۔

"بیس پیاری لڑکی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ اجنبی معلوم نہیں ہوتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں اسے جانتا ہوں۔ میں نے اب تک بیس کے ذکر سے احتراز

کیا۔ امید ہے کہ تم میری بات کا برا نہ مانو گے۔ مجھے احساسِ کمتری رہا ہے۔ یتیم خانے میں بڑا ہوا بے یارو مدد گار لڑکا، جس نے ماں باپ کی شکل نہیں دیکھی۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ میں کون ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ مجھ میں ہسپانوی اور فرانسیسی خون کی آمیزش ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میں اطالوی اور یونانی ہوں۔ کوئی۔"

"تم امریکن ہو۔ تمہاری قومیت پر کسے شبہ ہے؟"

"یہ تو درست ہے لیکن کسی قسم کا امریکن؟"

"ایسا امریکن جس کا نام ٹوبی جارج ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ بیس کی تصویر اپنے پاس رکھنا۔ ہم دونوں گھر جائیں گے۔ وہاں ہمارے کُنبے ہوں گے۔ ایک دوسرے سے ملا کریں گے، موسیقی ہو گی، کھیل ہوں گے۔ بڑا لطف رہے گا۔"

"مارکس مجھے تمہاری ایک ایک بات پر یقین ہے۔ خدا کی قسم تم پر پورا بھروسہ ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ باتیں محض دوستی کی وجہ سے نہیں کہہ رہے ہو۔ ان میں صداقت ہے۔ ایک دن ہم اکٹھا جائیں گے۔" ٹوبی پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"اگر خدانخواستہ بیس کو میں اچھا نہ لگا یا کوئی دوسرا پسند آ گیا؟ یا ہماری واپسی سے پہلے اس کی شادی ہو گئی۔ تب بھی میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں نے پہلی

مرتبہ محسوس کیا ہے کہ میرا بھی گھر ہے۔ عزیز و اقارب ہیں۔ میکالے خاندان کو اپنا کنبہ سمجھتا ہوں۔ مجھے ایسے سیدھے سادے لوگ بہت پسند ہیں۔ خدا کرے کہ یوں ہو جائے۔ سب کام حسبِ منشا انجام پائیں۔ میں اتھیکا چلا جاؤں اور باقی زندگی وہیں رہوں۔"

"خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔ ہم خیریت سے واپس لوٹیں گے۔ بقیہ زندگی اکٹھے گزرے گی۔ تم اور بیس، میری اور میں۔ دیکھ لینا۔" دونوں خاموش ہو گئے۔

کچھ سپاہی آ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ سب نے مل کر ایک نہایت چنچل گانا گایا۔ گاتے گاتے ٹوبی نے پوچھا۔ "دعاؤں پر تمہیں اعتقاد ہے؟"

مارکس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یتیم خانے میں بلا ناغہ دُعا مانگنی پڑتی ہے۔ خواہ مخواہ بلا کسی وجہ کے دعائیں مانگا کرتے۔"

"پتا نہیں۔ مگر میرا تو خیال ہے کہ دعا بھی خواہ مخواہ نہیں مانگی جاتی۔ وہ تو خود بخود ہونٹوں پر آ جاتی ہے۔"

"صحیح ہے۔ تبھی میں نے ان دنوں دُعا مانگنی چھوڑ دی تھی۔ لڑکپن سے اب تک

کچھ نہیں مانگا۔ لیکن اب پھر اعتقاد ہو چلا ہے۔"

ٹوبی دُعا مانگنے لگا۔ اس نے سر جھکایا نہ آنکھیں بند کیں، نہ ہاتھ جوڑے۔

بڑے خلوص سے بولا۔ "خدا تعالیٰ مجھے خیریت سے اتھیکا پہنچا! میرے مالک! جو تو کہے گا میں کروں گا۔ بس ایک دفعہ گھر پہنچ جاؤں۔ سب کی حفاظت کر سب کو دکھ درد سے بچا۔ بے گھروں کو پناہ دے۔ بھولے بھٹکوں کو راہ دکھا۔ آمین۔"

"خدا تمہاری دعا قبول کرے۔" مارکس نے کہا۔

ٹوبی کو یوں محسوس ہوا جیسے دعا نامکمل رہ گئی ہے۔

"اے معبود! میکالے کُنبے کی حفاظت کر۔ بیس کی حفاظت کر۔ کسی طرح اسے یقین ہو جائے کہ وہ مجھے عزیز ہے۔ مارکس اور میری کو محفوظ رکھ اور مارکس کی امّی اور دونوں بھائیوں کو بھی۔ قصبے کی رونق برقرار رہے۔ گلیاں آباد رہیں۔ بربط اور پیانو کے نغمے ختم نہ ہوں۔ اے خدا! دنیا کو اپنی حفاظت میں لے لے۔ آمین۔"

سپاہی ایک اور گیت گا رہے تھے، جس میں ہر شے کی بے ثباتی کا تذکرہ تھا خصوصاً عورتوں کی ناپاسدار محبت کا ذکر بار بار آتا تھا۔

گیت ختم ہوا تو گہری خاموشی چھا گئی۔ کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ پھر بھی سب چپ ہو گئے۔

آخر ایک سپاہی بولا۔ ”کیا ہوا؟ سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔ مارکس، اپنا آرگن باجہ نکالو۔ ٹوبی گیت سُنائے گا۔“

”کیا سُنو گے؟“

”کچھ سُنا دو۔ اتنی دیر سے بیہودہ گانے گا رہے ہیں اب صاف سُتھرے گیت سُننے کو جی چاہتا ہے۔ کوئی اچھی سی مقدس چیز۔ مقدس اور پاکیزہ۔“

”نعتیہ کلام میں سے تمھیں کیا پسند ہے؟“

”یہ لوگ میرے انتخاب پر ہنسیں گئے۔ مجھے یہ نعت پسند ہے۔ مضبوط بازوؤں کا سہارا۔“

”ٹوبی تمھیں یہ نعت آتی ہے؟ نہیں تو میں الفاظ بتاتا رہوں گا۔“

”دس برس تک ہر اتوار کو میں نے یہ نعت گائی ہے۔“ ٹوبی بولا۔

مارکس نے باجے پر دُھن نکالی، ٹوبی گانے لگا:

”کس قدر یگانگت محسوس ہوتی ہے اور کتنی محبّت

مضبوط بازوؤں کا سہارا ہے اور میں ہوں!

چاروں طرف برکت برس رہی ہے۔ سکون ہی سکون ہے

مضبوط بازوؤں کا سہارا ہے اور میں ہوں!

دو چار لڑکوں نے ساتھ دیا پھر تمام لڑکے مارکس اور ٹوبی کے گرد جمع ہو کر گانے لگے۔

کوئی خطرہ نہ کھٹکا، احساسِ تحفظ ہے اور سلامتی

مضبوط بازوؤں کا سہارا ہے اور میں ہوں!

رات کی تاریکی میں ٹرین تیزی سے جارہی تھی۔

ہومر کو مارکس کا خط

ہومر کے لیے یہ سنیچر بہت اہم تھا۔ معمولی سے واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ زندگی میں سنجیدگی آگئی۔ اسے رات کا بھیانک خواب یاد تھا کہ اس نے موت کے فرشتے کو قصبے سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ خواب حقیقت بن گیا۔

مارکس کا خط اس کی جیب میں تھا۔ وہ تھکا ہارا، لنگڑاتا ہوا گھر پہنچا۔ کاغذات دیکھے لیکن کوئی تار یا پیغام نہیں ملا۔ اب چھٹی تھی۔

"مسٹر گروگن میں باسی سموسے لے آؤں؟"

بوڑھا ساری شام پیتا رہا۔ خمار سے اس کی آنکھیں بوجھل تھیں۔

"میں ساتھ دیتا لیکن اس وقت کھانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"میرا بھی کچھ زیادہ جی نہیں چاہ رہا۔ خیال تھا کہ آپ بھوکے ہوں گے۔ آج دن

بھر مصروفیت رہی۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اب تک بھوک نہیں لگی۔ آپ سوچتے تو ہوں گے کہ یہ دن رات کام کرتا ہے پھر بھی اسے بھوک نہیں لگتی۔"

"ٹانگ اب کیسی ہے؟"

"پہلے سے اچھی ہے۔ با آسانی چل پھر سکتا ہوں۔ ویسے مجھے تو موچ یاد ہی نہیں رہی۔"

وہ بوڑھے کو عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مسٹر گروگن آپ نشے میں ہیں؟"

یہ سوال ایسے بھولپن سے پوچھا گیا تھا کہ بوڑھا خفا نہیں ہوا۔

"ہاں میں نشے میں ہوں۔ مخمور رہوں تو خوش رہتا ہوں۔"

بوڑھے نے بوتل نکال کر تین چار گھوٹ لیے۔ بیٹے میں ناصح نہیں ہوں کہ شراب کے خلاف تقریر شروع کر دوں۔ وہ احمق ہیں جو کہا کرتے ہیں مجھ سے سیکھو۔ شراب نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں ایسی خرافات سے پرہیز کروں گا۔ تم سمجھ دار ہو، روز نئی نئی باتیں سیکھتے ہو۔ ایک نصیحت کروں۔ دوسروں کے متعلق بھی زیادہ نہ سوچا کرو،

نہ ان کی باتوں اور حرکتوں پر توجّہ دیا کرو۔ اوروں کے بارے میں کبھی وثوق سے اظہارِ رائے نہیں کیا جاسکتا۔ بُرا نہیں ماننا۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم مجھے عزیز ہو۔ کسی کے قول یا فعل پر تنقید کرنا بُری بات ہے۔ مجھے لو، میں تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا، سوائے اس کے کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو اور تمہارے خیالات مجھے بیحد پسند ہیں۔ بڑھاپا آتا ہے تو انسان اچھوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ خصوصاً اس بات سے کہ اس کی موت کے بعد بھی اچھائی دنیا میں باقی رہے گی۔ یہی سوچو کہ میں نشے میں نہ ہوتا تو تم سے ایسی باتیں کرتا؟ شاید میرا شرابی ہونا اتنی بُری بات نہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ میرے حالات کیا ہیں۔ مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ میں کیوں پیتا ہوں؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے؟"

"جی نہیں۔"

"یہ شراب ہی ہے جو مجھے اپنا دل کھول دینے پر مجبور کرتی ہے تبھی تم سے ایسی گفتگو کیا کرتا ہوں۔ بیٹے خوش رہا کرو خدا کا شکر ادا کیا کرو جو جیسا بھی ہے، جس حال میں ہے، اسے ممنون ہونا چاہیے۔ اگر وہ اچھا ہے تو اس کی بھلائی صرف اسی تک محدود نہیں۔ مجھے بھی کچھ حصّہ ملتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ اس کے ذمّے یہ فرض ہے کہ اچھائی کو برقرار رکھے اور دوسروں میں پھیلائے۔ تم میں خوبیاں ہیں، خدا کا شکر بجالاؤ کیونکہ جہاں تم جاؤ گے لوگ تمہیں پہچان لیں گے، تمہیں

ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

نہ جانے کیوں ہومر کو وہ لڑکی یاد آگئی جس نے اس سے مقدس کمروں میں باتیں کی تھیں۔

"وہ فوراً بھانپ لیں گے کہ تم سچّے ہو۔ قابلِ اعتماد ہو۔ بے ضرر ہو۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ دنیا انہیں ٹھکرا دے گی۔ لیکن تمہیں ان سے نفرت نہیں ہو گی۔ دنیا انہیں غلط سمجھتی رہے لیکن تم ان کو پہچان لو گے۔ بیٹے تم کم سُن ہونے کے باوجود بڑے عظیم انسان ہو۔ تمہیں یہ عظمت کہاں سے ملی؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔ مجھ پر یقین کرو میں سچ کہتا ہوں۔ اور عظمت کے ساتھ ساتھ طبیعت میں انکساری پیدا کرو۔ اپنی خوبیوں کو برقرار رکھو۔"

"جی۔"

"میں نے تمہاری فطرت کا مطالعہ کیا ہے۔ کبھی میں نشے میں ہوتا ہوں، کبھی ہوش میں، لیکن تم سے ہمیشہ متاثر ہوا ہوں۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ دنیا کے ہر حصّے میں رہا ہوں۔ جوانی میں طرح طرح کے لوگ دیکھے ہیں۔ زندگی بھر مجھے اچھائی کی تلاش رہی۔ اجنبی قصبوں میں اَن جانے لوگوں میں مَیں نے اچھائی کا قرب محسوس کیا۔ یوں تو اس کی تھوڑی بہت جھلک ہر شخص میں دکھائی

دی۔ یہ کافی نہ تھی۔ اور اب برسوں کے بعد اس چھوٹے سے قصبے میں اچھائی کو تمہارے روپ میں دیکھا ہے۔ میں تمہارا ممنون ہوں۔ یہ لفافہ کیا ہے؟"

"بھائی مارکس کا خط آیا ہے۔ پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔"

"اب پڑھ لو۔"

"آپ سنیں گے۔"

"ضرور سنوں گا۔" بوڑھے نے چند گھونٹ اور لیے۔

ہومر نے بڑی حفاظت سے لفافہ کھول کر خط نکالا اور پڑھنے لگا:

"عزیز ہومر!

پیشتر اس کے کہ میں اور باتیں لکھوں، یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری جتنی چیزیں گھر میں رکھی ہیں کہ اب تمہاری ہیں۔ انہیں لے لو۔ جب تمہیں ضرورت نہ رہے تو یولی سیز کو دے دینا۔ میری کتابیں، گراموفون ریکارڈ، سائیکل، خورد بین، مچھلیاں پکڑنے کا سامان، پیڈرا کی پہاڑیوں سے اکٹھے کیے ہوئے پتھر اور بقیہ سب چیزیں لے لو۔ میرے کپڑے تمہیں ڈھیلے آئیں گے، لیکن چند برس بعد تم بڑے ہو جاؤ گے تو انہیں بھی لے لینا۔ بیس سے زیادہ تم حقدار ہو، کیونکہ

تم میکالے خاندان کے سرپرست ہو۔

جو کچھ میں نے پچھلے سال چھوٹے موٹے کام کر کے کمایا تھا وہ امّاں کو دے دیا ہے۔ انہیں ضرورت ہو گی۔ خرچ پورا نہ ہونے کی وجہ سے شاید امّاں اور بیس ملازمت کرنا چاہیں۔ میں گھر پر ہوتا تو انہیں کبھی نوکری نہ کرنے دیتا۔ امید ہے کہ تم بھی انہیں زیادہ محنت مشقت سے محفوظ رکھو گے۔ وہ اصرار کریں تب بھی انہیں منع کر دینا۔

میں سوچتا ہوں کہ تم گھر کس طرح چلاتے ہو گے جبکہ تمہیں سکول کا کام بھی رہتا ہے لیکن پھر اطمینان ہو جاتا ہے، کیونکہ تم بڑے ہمّت والے لڑکے ہو۔

اپنی تنخواہ میں سے صرف چند ڈالر لے کر باقی امّاں کو بھجوا دیتا ہوں، لیکن یہ قلیل رقم گھر کے اخراجات کے لیے ناکافی ہے۔ تمہارے کندھوں پر جو بوجھ آن پڑا ہے اس کا مجھے احساس ہے۔ جب میں نوکر ہوا تو میری عمر انیس سال کی تھی۔ تم اتنے چھوٹے ہو۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ خاندان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دو گے۔

تم بہت یاد آتے ہو۔ اکثر تمہارے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ تمہیں تو علم ہو گا کہ مجھے جنگ سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ اس جنگ سے بھی جو مجبوراً لڑنی پڑے۔

لیکن پھر یہ سوچتا ہوں کہ ملک کی خدمت کر رہا ہوں، جس میں اتھیکا ہے۔ ہمارا گھر ہے اور میکالے کنبہ ہے۔

جس شخص میں انسانیت کا مادہ ہے وہ کبھی میرا دشمن نہیں ہو سکتا۔ دشمن سے مجھے ذاتی عناد نہیں۔ عداوت ہے تو ان برائیوں سے جنہیں فنا کر دینا چاہیے جیسے میں خود اپنی برائیوں کو مٹا دینا چاہتا ہوں۔

میں اپنے آپ کو ہیرو نہیں سمجھتا نہ مجھ میں ہیرو بننے کی صلاحیت ہے۔ مجھے کسی سے نفرت نہیں۔ میں کٹر قسم کا وطن پرست بھی نہیں ہوں۔ مجھے اپنے ملک اور اس کے قصبوں اور باشندوں سے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ کاش میں فوج میں نہ ہوتا۔ کاش کہ جنگ نہ ہوتی! مگر چونکہ اب میں فوج میں ہوں اور ہم جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اچھا سپاہی بن کر دکھاؤں گا۔ پتہ نہیں کل کیا ہونے والا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا اس کے لیے تیار ہوں۔ میں خوفزدہ ہوں۔ بے حد خوفزدہ۔ لیکن وقت آنے پر ہرگز پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ فرائض میں کوتاہی کبھی نہ ہو گی۔

حکم چلانے اور حکم بجالانے سے مجھے نفرت ہے۔ وہی کروں گا جو ضمیر کہے گا۔ بطور سپاہی میری اہمیت کچھ زیادہ نہیں۔ فوج میں مجھ جیسے لاکھوں لڑکے ہیں۔ ہو

سکتا ہے کہ میں جنگ میں کام آ جاؤں۔ لیکن میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ بچ کر واپس گھر آؤں۔ اور بقیہ زندگی امّاں، بہن اور بھائیوں کے ساتھ گزار دوں اور میری اور میں اپنا گھر بنائیں۔

ہمیں بہت جلد محاذ پر بھیج دیا جائے گا۔ خبر نہیں ہم کس جگہ لڑیں گے لیکن اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اس لیے کہ اگر کچھ عرصے تک میرا خط نہ آئے تو گھبرانا مت۔ شاید یہ میرا آخری خط ہو۔ اگر ایسا ہوا تو کُنبے کا خیال رکھنا۔ یہ نہ سمجھنا میں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ دوسروں کو بھی محسوس نہ ہونے دینا۔

میرا ایک دوست ہے جو یتیم اور بے گھر ہے۔ عجیب بات ہے کہ سب لڑکوں میں سے میں نے اس کو منتخب کیا ہے۔ اس کا نام ٹوبی جارج ہے۔ میں اس سے گھر اور کُنبے کا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے اتھیکا آئیں گے۔

خط پڑھ کر جی بُرا مت کرنا۔ میں خوش ہوں کہ میکالے کُنبے کا ایک لڑکا فوج میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے وہ جذبات بھی تم تک پہنچ جائیں گے جنہیں میں الفاظ میں ادا نہ کر سکا۔ تم ضرور سمجھ جاؤ گے۔ کیونکہ ہمارے کُنبے میں تم سب سے اچھے ہو، ہمیشہ اچھے رہنا۔ تم کم سُن ہو۔ ابھی چودہ برس کے ہو۔ خدا کرے ساٹھ برس تک جیو، اس سے بھی زیادہ عمر پاؤ۔ سدا جیو۔ میری نگاہیں تم پر رہیں

گی۔ تمہارے ہی لیے تو ہم جنگ لڑ رہے ہیں۔ میرے عزیز بھائی! تم دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہو۔ اگر ہم اس وقت اکٹھے ہوتے تو یہ سب باتیں کیسے بتا سکتا تھا۔ تم ایک نہ سنتے، مجھ سے کُشتی لڑتے۔ مجھے نیچے گرا کر قہقہے لگاتے۔

جو کچھ میں نے خط میں لکھا ہے وہ سب صحیح ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اب میں تمہارا نام لکھتا ہوں۔ تم ہومر میکالے ہو۔ تم بہت یاد آتے ہو۔ تم سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اس دن کے لیے ایک ایک گھڑی گنتا رہتا ہوں۔ جب خدا ملائے گا۔ پھر تم بے شک مجھ سے کُشتی لڑنا۔ امّاں، بیس اور میری کے سامنے مجھے بچھاڑ دینا، میں ہر گز بُرا نہیں مانوں گا۔ اس دن کا مجھے انتظار رہے گا۔

خدا تمہارا محافظ ہو۔

تمہارا بھائی۔ مارکس۔

خط پڑھتے ہوئے بار بار ہومر کی آواز بھرائی۔ کئی دفعہ اس کی آنکھوں سے آنسو آئے۔ دم گھٹنے لگا۔ سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے میکسیکن عورت کے گھر میں ہوا تھا۔

ہومر کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور گروگن کی طرف دیکھا جو غم کی تصویر بنا ہوا تھا۔

”اگر اس بیہودہ جنگ میں میرا بھائی مارا گیا تو عمر بھر کے لیے مجھے دنیا سے نفرت ہو جائے گی۔ نیکی، ایمانداری، سچائی ان سب سے نفرت کروں گا۔ میں بد بن کر دکھاؤں گا۔ مجھ سے زیادہ بُرا کوئی نہ ہو گا۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔ جلدی سے اس نے وردی کا سفید کوٹ اور ٹوپی اُتار کر ایک طرف رکھی اور باہر بھاگ گیا۔

بوڑھا خاموش بیٹھا تھا۔ جب بہت دیر ہو گئی تو اُٹھا، بچی ہوئی شراب پی اور کاغذات سنبھالنے۔

بہت سا پیار پہنچے

اتھیکا عام قصبوں جیسا تھا۔ شروع شروع میں زندگی بے معنی اور مہمل سی معلوم ہوتی لیکن جوں جوں مہینے اور سال گزرتے زندگی کے دھندلے خاکے میں نقوش ابھرنے لگتے۔ اس رنگ آمیزی سے حسن نمایاں ہو جاتا، جاذبیت عود کر آتی۔ یہ حسن بد صورتی کو چھپا لیتا، ناشائستگی کو نستعلیق پن میں ڈھانپ دیتا اور برائی کو اچھائی میں۔ متضاد چیزوں کا یہ امتزاج انہیں ایک نئی دلاویزی بخشتا۔

تار کی مشین بجتی رہی۔ گروگن پیغام لکھ لکھ کر بھیجتا رہا۔ محبت بھرے پیغام، امید افزا سندیسے، کرب ناک فقرے، موت کی منحوس خبریں۔ ”میں گھر آ رہا ہوں۔“ ”سالگرہ مبارک ہو۔“ ”شعبۂ جنگ کو افسوس ہے کہ آپ کا لڑکا۔“ ”بہت سا پیار پہنچے۔“”میں خیریت سے ہوں۔“”خدا تمہیں خوش رکھے۔“

تار آتے رہے اور ہومر انہیں تقسیم کرتا رہا۔

میکالے خاندان کے گھر سے بربط کے نغمے سنائی دیتے۔ سپاہی متحرک تھے۔

وطن سے محاذ تک۔ خشکی پر، تری اور ہوا میں، یہ جنبش جاری رہی۔ نئ نئ جگہیں آباد ہو سکیں۔ نئے دونوں اور نئ راتوں کی تشکیل ہوئی۔ طرح طرح کی مشکلات، عجیب عجیب خطرے وجود میں آئے۔ زندگی بظاہر ویسی ہی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس میں بتدریج تبدیلیاں آرہی تھیں۔ ہر چیز بدل رہی تھی۔ اس تغیر کی زد سے کوئی نہ بچ سکا۔ مارکس، ٹوبی، ہومر، سپنگلز، گروگن، مسز میکالے، یولی سیز، ڈائنا، آگی، لائنل، بیس، میری، مقدس کمروں والی لڑکی، روزالی، سمز پیباڈی، مسٹر ایرا اور اس کالڑکا جان، موٹا کرِس، مس ہکس اور یہاں تک کہ مسٹر میکینو بھی۔

مال گاڑی جس میں حبشی گارہا تھا چلتی رہی، گلہریاں اپنے بِلوں سے جھانکتی رہیں۔ ہینڈرسن کی خوبانیاں پک کر سنہری ہو گئیں۔ لڑکے کئی بار چرانے آئے۔ صحن میں یولی سیز مرغیوں اور چوزوں کو غور سے دیکھتا گیا۔ ہومر کی موچ ٹھیک ہو گئی۔ قصبے میں ایسٹر کا تہوار منایا گیا۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا پھر ایک اور۔ ہفتے اور مہینے گزرتے رہے۔

میکالے خاندان کے افراد میری کو لے کر گرجے میں دُعا مانگنے آئے تھے۔ یولی سیز اپنی ماں کے ساتھ بنچ پر بیٹھا تھا۔ اتفاق سے اس کے سامنے ایک ایسا معمّر شخص تھا جو بالکل گنجا تھا۔ یولی سیز کو یہ نظارہ بے حد دلفریب معلوم ہوا۔ گنجے سر

کی گولائی اور چمک دیکھ کر اسے انڈا یاد آ گیا۔ لیکن سر بالکل صاف نہیں تھا۔ پانچ چھ بال بھی اُگے ہوئے تھے۔ ایک لمبی سی سلوٹ نے سر کو دو حصّوں میں یوں بانٹ دیا تھا جیسے خطِ استواء کرہِ ارض کو تقسیم کرتا ہے۔ یہ گنجا سر قدرت کی صنّاعی کی بہترین مثال تھی۔

پادری عبارت پڑھ رہا تھا۔ پہلے وہ ایک فقرہ پڑھتا۔ پھر سب مل کر اگلا فقرہ پڑھتے۔

"حضرت عِیسیٰ نے ہجوم کو دیکھا تو آپ پہاڑ پر تشریف لے گئے۔ آپ پتھر پر بیٹھے تو حواری حاضر ہوئے۔" پادری بولا۔

"لب مبارک کھلے اور آپ نے فرمایا۔" اور حاضرین نے جواب دیا۔

"مبارک ہیں وہ لوگ جو غریب ہیں، انہیں بہشت عطا ہو گا۔"

"مبارک ہیں وہ جو سوگوار ہیں، وہ تسکین پائیں گے۔"

"مبارک ہیں وہ جو نیک کرداری کی راہ میں بھوک اور پیاس سہتے ہیں، یہ بھوکے پیاسے نہیں رہیں گے۔"

"مبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں۔ ان پر خاص مراعات ہوں گی۔"

"مبارک ہیں وہ جن کے دل پاکیزہ ہیں۔ انہیں خدا کا دیدار نصیب ہو گا۔"

"مبارک ہیں وہ جو امن کے خواہاں ہیں۔ وہ خدا کے خاص بندے کہلائیں گے۔"

"مسرور ہو جاؤ، خوشیاں مناؤ، تم دنیا کی بہترین مخلوق ہو، تم دنیا کا اجالا ہو۔"

"یہ روشنی اتنی چمکے کہ دوسرے تمہاری نیکیوں سے متاثر ہو کر تمہارے مقدس باپ کی حمد و ثناء کریں۔ باپ جو بہشت میں ہے۔"

صحیفوں کی تلاوت شروع ہوئی۔ یولی سیز گنجے سر کے مطالعے میں محو تھا۔ اس پر کہیں سے آ کر مکھّی بیٹھ گئی اور چہل قدمی کرنے لگی۔ یولی سیز مکھّی کو دیکھتا رہا۔ اس نے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مسز میکالے نے چپکے سے ہاتھ پکڑ لیا۔ مکھّی اور گنجے سر کو دیکھتے دیکھتے وہ خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ پھر جیسے وہ چمکدار سر ایک صحرا میں تبدیل ہو گیا۔ سلوٹ ندی نظر آنے لگی۔ چھ سات بالوں نے کھجور کی شکل اختیار کر لی۔ مکھّی شیر بن گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ ندی کے کنارے پر کھڑا ہے۔ شیر دوسری طرف ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔

گرجے میں صحیفوں کی تلاوت جاری تھی۔

پھر دور ایک عرب دکھائی دیا، جو لبادہ اوڑھے ریت پر لیٹا سو رہا تھا۔ پاس طنبورہ اور پانی کی صراحی رکھی تھی۔

شیر ٹہلتا ٹہلتا عرب کے قریب پہنچا اور اسے سُونگھنے لگا۔ شیر کے چہرے پر ایک معصومیت اور سکون تھا کہ یولی سیز کو یقین ہو گیا کہ وہ عرب کو کچھ نہیں کہے گا۔

تلاوت ختم ہوئی۔ آرگن بجنے لگا۔ بچّے حمدیہ نغمہ ''زمانے کی چٹان'' گانے لگے۔

یولی سیز چونک اٹھا۔ سارا طلسم درہم برہم ہو گیا۔ عرب اور شیر غائب ہو گئے لیکن اب سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا جس میں ایک چٹان ابھری ہوئی تھی۔ تیز و تند موجیں آکر ٹکراتیں۔ جان بچانے کا ذریعہ یہی ایک چٹان تھی۔ یولی سیز نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ صرف اس کا سر اور بازو پانی سے باہر تھے۔ اس نے صبر اور امید کا دامن نہیں چھوڑا۔

اتنے میں ایک عظیم شبیہ پانی پر چلتی ہوئی آئی اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھالیا۔ یہ موٹا کرِس تھا۔

لیکن وہ پھر پانی میں گِر گیا۔ موٹے کرِس نے دوبارہ اسے نکالا اور دونوں پانی پر چلنے لگے۔ دُور افق پر ایک خوشنما شہر نظر آرہا تھا۔ سرسبز باغات تھے جن سے اجلی اجلی عمارتیں جھانک رہی تھیں۔

گیت ختم ہو گیا۔

کوئی یولی سیز کو جھنجھوڑنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

یہ لائنل تھا جس کے ہاتھ میں چندہ جمع کرنے کی رکابی تھی۔ یولی سیز نے جلدی سے ایک سکہ نکال کر رکابی میں ڈال دیا۔

لائنل نے یولی سیز کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”بخشش ہوئی یا نہیں؟“

”کیا؟“

”اسے پڑھو۔“ لائنل نے ایک کتابچہ دیا۔ یولی سیز عبارت نہ پڑھ سکا۔ پہلے صفحے پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

”آپ بخشش کے طالب ہیں؟ تو مزید دیر مت کیجئے۔“

لائنل نے یہی سوال ایک معمر شخص سے پوچھا۔

”آپ بخشش کے طالب ہیں؟“

بوڑھا خفا ہو گیا۔ ”چلو چلو۔ آگے بڑھو۔“

لائنل حیران رہ گیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے اس نے بوڑھے کے ہاتھ میں

کتابچہ تھما دیا۔ بوڑھے نے لائنل کو یوں گھورا جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔

"کیا ہوا؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ یہ بد تمیز مجھ سے پوچھتا ہے بخشش ہوئی یا نہیں؟ اور یہ کتابچہ خواہ مخواہ دے گیا ہے۔

اس نے فرش پر پڑا ہوا کتابچہ اٹھا کر عبارت پڑھی۔

بیوی نے اس کے بازو کو تھپتھپایا۔ "بے چارے لڑکے کو کیا خبر کہ تم چین میں تیس سال پادری رہ چکے ہو۔"

آرگن بج رہا تھا۔ لڑکے گا رہے تھے۔ لائنل، آگی اور اس کے ساتھی رکابیاں لیے کونے میں کھڑے تھے۔ موسیقی ختم ہو گئی تو لڑکوں نے جمع کیا ہوا چندہ میز پر رکھ دیا اور اپنے والدین کے پاس جا بیٹھے۔

شیر کی ہنسی

گرجا سے واپس آکر آگی نے ٹینس کا ایک پرانا جال نکالا اور گھر کے دروازے کے سامنے بیٹھ کر مرمت کرنے لگا۔ پڑوس سے اینوک ہاپر پرانی فٹ بال لیے آیا اور آگی کے سامنے گیند اچھالنے لگا۔ بار بار اسے زمین پر مارتا اور ہوا میں دبوچ لیتا۔ یہ لڑکا قصبے بھر میں سب سے بے چین اور چُلبلا تھا۔ ہر وقت اُلٹی سیدھی ہانکنا اس کی عادت تھی۔

”یہ کیا ہے آگی؟“

”جال۔“

”مچھلیاں پکڑو گے؟“

”نہیں جانور پکڑوں گا۔“

”دفع کرو، آؤ فٹ بال کھیلیں۔ پھر تالاب کی طرف چلیں گے۔“

”نہیں یہ پھندہ بنالوں۔“

”پھندہ کس لیے بنا رہے ہو؟“

”کہہ تو دیا کہ جانور پکڑوں گا۔“

”یہاں کہاں دھرے ہیں جانور؟ چلو تیرتے ہیں۔“

”اسی پھندے سے جانور پکڑ کر دکھاؤں گا۔“

”شرط لگالو اس ردّی جال میں مکھّی بھی نہیں پکڑی جا سکتی۔ چلو ٹارزن کی فلم دیکھیں۔“

”پہلے نمونے کے طور پر کتّا پکڑوں گا۔ جب یقین ہو جائے گا کہ پھندا ٹھیک ہے تو بڑے جانوروں کی باری آئے گی۔“

”یہ پرانا بوسیدہ جال، جو شاید کباڑیے سے خریدا گیا ہے، بالکل بیکار ہے۔ چلو جیل میں قیدیوں سے باتیں کریں۔“

”فی الحال میں مصروف ہوں، شام کو اسے آزمانا چاہتا ہوں۔“

”کس چیز پر آزماؤ گے؟ سارے قصبے میں مشکل سے ایک گائے، چار کتّے، چھ

سات خرگوش اور بیس مرغیاں ہوں گی۔ جب جانور ہی نہیں تو پکڑو گے کیسے؟“

”جناب! اس میں ایک ریچھ آ سکتا ہے۔“

”ریچھ تو پھنسنے کے لیے منتظر ہی بیٹھا ہو گا۔ اس سے تم ایک فٹ کا ریچھ بھی نہیں پکڑ سکتے۔ چلو چینیوں کے محلّے میں چلتے ہیں۔“

آگی نے فوراً کام چھوڑ دیا۔

”تمہیں چینیوں سے ڈر نہیں لگتا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ چینی خطرناک ہوتے ہیں تو ہوا کریں۔ میں اتنا تیز دوڑتا ہوں کہ وہ میری گرد کو نہیں پہنچ سکتے، شاید تم نے مجھے دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”شیر تو تم سے تیز بھاگتا ہو گا۔“

”میں بھاگنے پر آؤں تو چیتے، شیر، چینی۔ سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کوئی میرے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ چلو ریلوے لائن کے پار دوسرے محلّے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلیں۔“

"میرے خیال میں شیر کو پکڑنا آسان ہے، لیکن تمہیں پکڑنا مشکل ہے۔"

"دنیا کا کوئی پھندا مجھے نہیں پکڑ سکتا۔ چلو بڑے میدان میں ایک میل کی دوڑ لگائیں۔ تمہیں سو گز کی رعایت ملے گی۔"

"شاید تمہارے بزرگ بھی تمہیں نہیں پکڑ سکتے۔"

"بزرگ ہوں یا کوئی اور، میں سب سے آگے نکل جاؤں گا۔"

اتنے میں لائنل آ گیا۔

"آگی کیا کر رہے ہو؟"

"جانوروں کے لیے پھندہ بنا رہا ہوں۔"

"اسے اتنا سمجھایا ہے کہ ٹینس کے پرانے جال میں کچھ نہیں پھنس سکتا۔ لیکن یہ باز نہیں آتا۔ فٹ بال بھی نہیں کھیلتا۔ تم کھیلو گے؟" اینوک نے لائنل سے پوچھا۔

"میں؟" لائنل حیران رہ گیا۔

"ہاں تم پورے زور سے گیند میری طرف پھینکنا۔ میں آہستہ سے لوٹا دوں گا۔

آؤ، دن ڈھلتا جا رہا ہے، دیر مت کرو۔"

"اچھا۔ لیکن زور سے نہ پھینکنا۔ مجھے گیند دبوچنے کی مشق نہیں ہے۔ ذرا چُوک ہو جائے تو مُنہ پر لگتی ہے۔ کئی دفعہ آنکھ اور ناک پر چوٹ لگ چکی ہے۔"

"فکر مت کرو بالکل آہستہ پھینکوں گا۔"

دونوں سامنے کے میدان میں کھیلنے چلے گئے۔ آگی جال کی مرمت کرنے لگا۔ آخر اس نے سارے ٹکڑوں کو اکٹھا سی لیا۔ جال کو کھینچ کر دیکھا تو بہت خوش ہوا۔

مینو گین دوڑا ہوا آیا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جانور پکڑنے کا جال بنایا ہے۔ اسے آزمانا ہے، مدد کرو گے؟"

"ضرور۔"

"میں ایرا کی دکان کے پیچھے چھپ جاؤں گا۔ اینوک سامنے کھیل رہا ہے۔ اسے پکڑنا شیر پکڑنے سے زیادہ مشکل ہے۔ وہ جال میں آ گیا تو سمجھ لیں گے کہ پھندہ مضبوط ہے۔ میں چھپتا ہوں، تم اسے بلاؤ۔ کہنا کہ کچھ پوچھنا ہے۔"

''اچھا۔''

مینو گین نے آواز دی۔ ''اینوک ذرا بات سننا۔''

''کیا ہے؟'' وہ چلّایا۔

''ایک بات پوچھنی ہے۔''

''تو پوچھ لو۔''

''پہلے یہاں آؤ۔''

''ابھی آیا۔''

''مینو گین تم بھی چھپ جاؤ۔ جال کا ایک سرا میں پکڑ تا ہوں، دوسرا تم تھام لو، جو نہی وہ قریب آیا، دبوچ لیں گے۔''

اینوک بڑبڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ ''چلو تالاب میں تیرتے ہیں۔ اتنا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ یارو کچھ کرو آخر انتظار کس کا ہے؟''

ایرا کی دکان کے پیچھے دونوں لڑکے منتظر تھے۔ چند ہی لمحوں میں اینوک جال میں تھا۔

اس نے پھنسے ہوئے شیر کی طرح اچھل کود شروع کر دی۔ دونوں شکاریوں نے اسے مطیع کرنے کی بڑی کوشش کی۔

کم بخت جال یہ بوسیدہ تھا۔ اینوک کو آزاد ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ جال ایک طرف پڑا تھا۔

اس نے گیند اُچھالی۔ ”چلو آگی چلیں۔ اس جال میں تو مکھّی بھی نہیں آئے گی، چلو۔“

”اچھا۔“ آگی نے جال اٹھا کر صحن میں پھینک دیا۔

”چلو جیل خانے میں قیدیوں سے باتیں کریں گے۔“

تینوں لڑکے بھاگے۔ لائنل پیچھے پیچھے تھا۔

”ذرا تیز چلو، یہ کیا چیونٹیوں کی طرح رینگ رہے ہو۔“ اینوک چلّایا۔

سامنے درخت پر پرندہ بیٹھا تھا اس نے تاک کر گیند ماری، لیکن پرندہ اُڑ گیا۔

درخت اور انگور کی بیلیں

سپنگلز اور ڈائینا کار میں مضافات کی سیر کر رہے تھے۔

سپنگلز نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "یہ قطار انجیر کے درختوں کی ہے۔ ان کے پیچھے انگور کی بیلیں ہیں۔ وہ زیتون کے درخت ہیں۔ پرے انار کا پیڑ ہے۔ وہ آڑوؤں کا جھرمٹ ہے۔ اور یہ خوبانیوں کا۔ یہ دنیا کی حسین ترین وادی ہے، ایسا کوئی پھل نہیں جو یہاں نہ ہوا ہو۔"

"تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ہے نا؟"

"مجھے ہر شے سے محبت ہے۔ یہ مت پوچھا کرو کہ میں تمہیں چاہتا ہوں یا نہیں، کیونکہ مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ تم نہایت عزیز ہو۔ مجھے دنیا بھی عزیز ہے۔ اور دنیا کی سب چیزیں بھی۔ کئی مرتبہ میں نے زندگی کو ایک دھارے کی شکل میں بہتے دیکھا، چمکتا ہوا شفاف چشمہ، جس کے دونوں طرف روئیدگی تھی، سرسبز و شاداب۔ پودے جن میں طرح طرح کے پھل لگے ہوئے تھے۔ ان کے

پتّوں میں انسان، قبیلے اور قوموں کے عارضوں کے لیے شفا تاثیر تھی۔"

اس نے ڈائنا کو چوم لیا۔

"میرے محبوب! تم مسرور ہو نا؟"

"میں نہیں جانتا کہ مسرت کیا ہے۔ جو کچھ بھی ہے اس وجدانی کیفیت کو محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے اپنا بازو ڈائنا کے گرد حمائل کر دیا۔

"اب اور انتظار نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال میں ہمارے گھر میں ایک بچّی آنے والی ہے، ننھی مُنّی سی، بالکل تمہاری شکل کی۔ مجھے لڑکیاں اچھی لگتی ہیں، خصوصاً ان کی میٹھی میٹھی باتیں۔ میں تمہیں بالکل الہڑ سمجھتا تھا۔ لیکن جو لڑکی ماں بننے والی ہو وہ الہڑ نہیں رہتی۔"

"میں کتنی خوش ہوں۔ میرے دل میں ذرا سا بھی ڈر نہیں۔"

کار باغیوں کے قریب سے گزر رہی تھی۔ جہاں اتھیکا کے باشندے اتوار گزارنے آیا کرتے۔ بڑی رونق تھی۔ لوگ تفریح کے لیے آئے ہوتے تھے۔ موسیقی تھی۔ ناچ ہو رہا تھا۔ اطالوی، یونانی، یوگوسلاویہ کے آرمینی، امریکن ہر قسم کے لوگ تھے۔ ہر گروہ کی دُھنیں اور رقص جُدا گانہ تھے۔ سپنگلز کسی گروہ

کے قریب سے گزرتا تو تھوڑی دیر کے لیے کار ٹھہرا لیتا۔

"یہ یونانی ہیں۔ ان کی موسیقی صاف بتا رہی ہے۔ اس لڑکی کا رقص دیکھا؟ اپنے وطن میں یہ اسی طرح ناچتے ہیں۔"

سپنگلز نے پھر کار روک لی۔ "یہ آرمینی ہیں۔ پادریوں اور بچّوں کی تعداد سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مذہب پرست قوم ہے۔ ہر کُنبے میں درجنوں بچّے ہوتے ہیں۔ یہ کچھ کچھ یونانیوں سے بھی ملتے ہیں۔ ویسے یہ سب سے مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ بوڑھا کیسے مزے سے ناچ رہا ہے۔ اور وہ یوگوسلاویہ سے آئے ہیں۔ ملک ملک کے آدمی یہاں ہیں، لیکن دیکھا جائے تو سب ایک جیسے ہیں۔"

اس نے ڈائنا کو کھینچ کر قریب کر لیا اور اس کی زلفوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"اور جو وہ آرمینی بچّیوں جیسی ہوئی تو اور کچھ کچھ اطالوی بچّیوں جیسی بھی ہو۔"

اس نے کار ٹھہرا لی۔ "جانتی ہو یہ کون ہیں؟ یہ اطالوی بچّے ہیں۔ ان میں کاربٹ بھی ہو گا۔"

کار چل پڑی۔ یہ نیا گروہ سب سے زندہ دل اور شوریدہ سر تھا۔ ان کی موسیقی میں بے پناہ شوخی تھی اور رقص میں چنچل پن۔

"یہ امریکن ہیں۔ اور ان میں دنیا کی سب قومیں شامل ہیں۔ پرتگالی، حبشی، یہودی، انگریز۔ ان کے نغمے تو سنو۔"

کار آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ موسیقی کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔

میرے عزیز گھر

سان فرانسسکو سے آنے والی ٹرین اتھیکا کے اسٹیشن پر ٹھہری۔ نو مسافر اُترے۔ ان میں دو سپاہی تھے۔ ٹرین چلنے سے پہلے تیسرا سپاہی لنگڑاتا ہوا اُترا اور آہستہ آہستہ قصبے کی طرف چل دیا۔

پہلے سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "گھر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ میرے عزیز گاؤں میں نے تجھے کس قدر یاد کیا ہے۔ تری خاک کو بوسہ دیتا ہوں۔"

اس نے جھک کر زمین چوم لی۔

"ایک اور بوسہ، ایک اور۔" وہ فرش کو چوم رہا تھا۔

"ہنری! یہ کیا کر رہے ہو۔ خدا کے لیے اٹھو اور گھر چلو! لوگ کہیں گے کہ سپاہی پاگل ہو گئے ہیں۔" اس کے ساتھی نے کہا۔

"سمجھنے دو ڈینی، مجھے کیا پرواہے۔ بس یونہی پیار آگیا تھا۔"

"ہمیں دیکھ کر رشتہ دار حیران تو ہوں گے۔"

"میرے عزیز تو خوشی کے مارے بول نہیں سکیں گے۔ دیکھ لینا کسی کے مُنہ سے بات نہ نکلے گی۔"

چلتے چلتے دونوں ایرا کی دکان کے قریب پہنچے۔ پھر یکایک بھاگنے لگے اور سامنے کے دو مکانوں میں گھس گئے۔

آلف رائف کسی کام کو جارہا تھا۔ اس نے جو یہ تماشا دیکھا تو ٹھہر گیا۔

دروازے کھلے، دو بوڑھی عورتیں نکلیں اور سپاہیوں سے بغل گیر ہو گئیں۔ ذرا سی دیر میں بہت سے مرد، عورتیں اور بچّے اکٹھے ہو گئے اور سپاہیوں سے معانقہ کرنے لگے۔

اچانک آلف چلّایا۔ "امی یہ تو پڑوسیوں کا لڑکا ہے۔ ڈینی بوتھ۔ غلط گھر میں آ گھسا ہے۔ مسز بوتھ آپ کا بیٹا غلطی سے ہمارے ہاں آگیا ہے۔ ہمارا لڑکا آپ کے پاس ہے۔"

مسز رائف نے چونک کر لڑکے کو دیکھا۔ "ارے یہ تو ڈینی ہے۔ میں تمہیں

ہنری سمجھتی رہی۔"

"کوئی بات نہیں مسز رائف، میں ادھر امّی سے بھی پیار کرواؤں گا۔" ڈینی بولا۔

ہنری دوسرے مکان میں کہہ رہا تھا۔ "مسز بوتھ۔ ڈینی امّی کے پاس ہے۔ آپ ذرا دیر کے لیے ہمارے ہاں آیئے۔"

مکانوں کے سامنے کافی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ آلف زور زور سے چلّا رہا تھا۔ "آہ! لڑکے غلط گھروں میں جا گھسے۔ پڑوسیوں کا ڈینی ہمارے ہاں چلا آیا اور ہمارا ہنری ان کے ہاں۔ ہنری آ جاؤ۔ امّی یہاں ہیں۔"

محبت لافانی ہے

اتوار کی سہ پہر کو ہومر اپنی بہن کو لے کر سیر کو نکلا۔ سینما ہال کے باہر لوگوں کی قطار لگی ہوئی تھی جس میں لائنل بھی تھا۔

"لائنل سینما کی تیاری ہے؟" ہومر نے پوچھا۔

"ارادہ تو ہے لیکن دام نہیں ہیں۔"

"تو قطار میں کیوں کھڑے ہو؟"

"آگی، اینوک، مینوگین اور میں قیدیوں سے باتیں کرنے جیل خانے گئے تھے لیکن انہوں نے مجھے بھگا دیا۔ واپسی میں لوگوں کی قطار دیکھی تو اس میں شامل ہو گیا۔"

"کتنی دیر سے کھڑے ہو؟"

"ایک گھنٹے سے۔"

"فلم دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے؟" ہومر نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"بیکار پھر رہا تھا۔ سوچا یہیں وقت گزاروں۔ ویسے فلموں کا مجھے زیادہ شوق نہیں ہے۔"

"تو ہمارے ساتھ سیر کو چلو۔ تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔"

"شکریہ! یہاں کھڑا کھڑا تنگ آچکا ہوں۔"

تھوڑی دور جا کر یولی سیز کو کچھ نظر آگیا۔ لنکن کے زمانے کا ایک سِکّہ زمین پر گرا پڑا تھا۔

"اسے اٹھالو یولی سیز، ایسا سِکّہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔"

بچّے نے سِکّہ اُٹھالیا اور اپنی خوش نصیبی پر مُسکرانے لگا۔

وہ تار گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں میں کام کرتا ہوں۔ صرف چھ مہینے ہوئے ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیاں گزر چکی ہیں۔"

تار گھر میں کوئی تھا۔ ہومر نے جھانک کر دیکھا۔

"شاید مسٹر گروگن کام کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں چھٹی کے دن کیوں چلے آئے۔ ذرا پوچھ آؤں۔ ابھی آیا۔"

اس نے دوڑ کر سڑک عبور کی اور دفتر میں چلا گیا۔ تار کی مشین کھڑک رہی تھی۔ لیکن گروگن دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔

"مسٹر گروگن اُٹھیے۔ آپ کو کوئی بلا رہا ہے۔ جاگیے۔"

لیکن گروگن نہ اُٹھا۔ ہومر دوڑتا ہوا بہن کے پاس گیا۔

"مسٹر گروگن کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ان کی دیکھ بھال میں شاید دیر لگ جائے۔ آپ چلیئے۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔"

"بہت اچھا ہومر۔" بہن بولی۔

"انہیں تکلیف کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے جلد پہنچنا ہے۔" ہومر نے بھاگتے ہوئے کہا۔ "تکلیف وکلیف کچھ نہیں۔ فقط ضعیفی ہے۔"

واپس آکر اس نے گروگن کو کئی مرتبہ جھنجھوڑا۔ پانی کے چھینٹے دیئے۔ تب کہیں

جا کر بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔

"جی میں ہومر ہوں۔ مجھے علم نہ تھا کہ آج آپ کام پر آ رہے ہیں ورنہ کبھی کا پہنچ گیا ہوتا۔ میں تو یونہی جا رہا تھا کہ آپ کو دیکھ لیا۔ ابھی کافی لاتا ہوں۔" بوڑھے نے سر ہلایا اور ٹائپ رائٹر میں نیا کاغذ لگا کر تار کی مشین کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہومر فوراً کاربٹ کی دکان پر پہنچا اور کافی مانگی۔

"تازہ بن رہی ہے دو تین منٹ میں تیار ہو جائے گی۔"

"اگر تھوڑی سی کہیں پڑی ہو تو اس وقت دے دیجئے۔"

"بالکل ختم ہو چکی ہے۔ لیکن جلد تیار ہو جائے گی۔"

"ابھی ضرورت تھی۔ خیر میں ابھی آ کر لے جاؤں گا۔"

ہومر نے واپس پہنچ کر دیکھا کہ تار کی مشین بج رہی ہے لیکن بوڑھا خاموش ہے۔

"مسٹر گروگن! اُٹھیے کہیں سے پیغام آ رہا ہے۔ انہیں کہہ دیجئے کہ ذرا انتظار کر لیں۔ اتنے میں کافی تیار ہو جائے گی۔ میں دوڑ کر لے آؤں گا۔ جاگیے، مسٹر گروگن۔" ہومر دُکان کی طرف بھاگا۔

بوڑھے نے ٹائپ شدہ پیغام کی طرف دیکھا۔

کاغذ پر لکھا تھا:

مسز میکالے

۲۲۲۶ سانتاکلاراایونیو

اتھیکا۔ کیلیفورنیا۔

شعبۂ جنگ کو افسوس ہے کہ آپ کا بیٹا مارکس۔۔۔۔۔

بوڑھے نے کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے دورہ پڑ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے سینہ تھام لیا اور ٹائپ رائٹر پر جھک گیا۔

ہومر کافی کا پیالہ لیے ہوئے آیا۔ تار کی مشین خاموش تھی۔ دفتر میں ہولناک خاموشی طاری تھی۔

"مسٹر گروگن !اُٹھیے۔ میں کافی لایا ہوں۔"

اس نے سہارا دے کر بوڑھے کو ٹائپ رائٹر سے اُٹھایا۔ دفعتہً اس کی آنکھوں کے سامنے ٹائپ شدہ عبارت کوند گئی۔ الفاظ پڑھے بغیر ہومر پیغام کا مفہوم سمجھ گیا

اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ پھر بھی وہ بوڑھے کو تھامے رہا۔

"مسٹر گروگن۔"

اتنے میں دوسرا ہرکارہ فیلکس جو اتوار کو کام کرتا تھا آ گیا۔ اس نے بوڑھے کو غور سے دیکھ کر کہا۔

"ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"پاگل ہو گئے ہو؟" ہومر چلایا۔

"یہ مر گئے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" ہومر نے چیخ ماری۔

"مسٹر سپنگلز کو بلاتا ہوں۔" فیلکس نے ٹیلی فون کیا مگر جواب نہ ملا۔

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اب کیا ہو گا؟"

ہومر ٹائپ رائٹر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ فیلکس نے عبارت پڑھی اور ہومر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "پیام نامکمل ہے۔ ممکن ہے کہ تمہارا بھائی زخمی ہو گیا ہو یا اسے دشمن نے قید کر لیا ہو۔"

ہومر نے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ "انہوں نے پورا پیغام سُنا تھا۔ جان بوجھ کر ٹائپ نہیں کیا۔ انہوں نے اچھی طرح سُن لیا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ نہ سُنا ہو۔ میں پھر ٹیلی فون کرتا ہوں۔ شاید مسٹر سپنگلز گھر پہنچ گئے ہوں۔"

ہومر خالی خالی آنکھوں سے در و دیوار کو تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت تھی، کراہت تھی اور غصّہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔

سپنگلز نے اپنی کار تار گھر کے سامنے ٹھہرائی۔ فیلکس دوڑ کر باہر گیا۔

"مسٹر سپنگلز! میں نے کئی دفعہ فون کیا لیکن آپ گھر پر نہیں تھے۔ بڑی بُری خبر ہے۔ مسٹر گروگن کا انتقال ہو گیا ہے۔"

سپنگلز ڈائنا سے بولا۔ "تم گھر چلی جاؤ میں دیر سے آؤں گا۔ کھانے پر انتظار مت کرنا۔ یا یوں کرو کہ اپنے والدین کے ہاں چلی جاؤ۔ تمہیں کل لے لوں گا۔"

"بہت اچھا۔"

سپنگلز جلدی سے اندر گیا۔ گروگن کی طرف دیکھا، پھر ہومر کی طرف۔

”فیلکس! ڈاکٹر نیلسن کو فون کر دو کہ اسی وقت چلے آئیں۔“

اس نے بوڑھے کو کرسی سے اٹھایا اور عقبی کمرے میں صوفے پر لِٹا دیا۔ واپس آ کر ہومر کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

”ہومر! جی بُرا مت کرو۔ مسٹر گروگن ضعیف العمر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ موت اچانک آ جائے۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے گزر جائیں۔“

تار مشین بجنے لگی۔ سپنگلز پیغام لینے کے لیے جھکا تو اسے ٹائپ رائٹر میں لگا ہوا کاغذ نظر آ گیا اور دیر تک وہ سر جھکائے سطروں کو پڑھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ہومر کی جانب اٹھ گئیں۔

اس نے مشین پر مکمل پیغام لیا، بلکہ دہرایا بھی۔ وہ چپ چاپ اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور دیر تک خلا میں تکتا رہا۔ اس کی انگلیاں اُبلے ہوئے انڈے سے کھیلتی رہیں۔ جسے وہ خوش نصیبی کی علامت سمجھا کرتا۔ اس نے غیر ارادی طور پر انڈا توڑ دیا۔ اور چھلکے پھینک کر سفیدی کھانے لگا۔

”فیلکس! تار گھر کے کام کے لیے ہیری بیرک کو ابھی بلا لو۔ ڈاکٹر نیلسن بھی آتے ہوں گے۔ ان سے کہنا کہ بعد میں گفتگو کروں گا۔“

ہومر نے اٹھ کر ٹائپ رائٹر سے نامکمل تار نکالا۔ اسے لفافے میں بند کر کے کوٹ کی جیب میں رکھا اور دوسری کاپی کو حفاظت سے فائل میں لگا دیا۔

سپنگلز نے اسے بازو سے تھام لیا۔ ”آؤ ہومر! ذرا سیر کو چلتے ہیں۔“

تار گھر سے نکل کر دونوں سڑک پر چلنے لگے۔ دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ آخر ہومر بولا۔ ”انسان کیا کرے؟ کس سے بدلہ لے؟ کس سے نفرت کرے؟ سوچ رہا ہوں کہ کون ہے جو اس کا ذمّہ دار ہے؟ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ زندگی عجیب تماشا؟ دوستی اور محبّت کیسی ناپائیدار چیزیں ہیں۔“

سامنے سے آگی اور اس کے ساتھی آرہے تھے۔ انہوں نے سلام کیا۔ ہومر نے ہر ایک کا نام لے کر سلام کا جواب دیا۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور آسمان شفق سے جگمگا رہا تھا۔

”کسے بُرا بھلا کہوں؟ کسے کوسوں؟ مجھے تو کسی سے نفرت بھی نہیں۔ اس دن دوڑ میں بائی فیلڈ نے مجھے پٹخ دیا لیکن میں نے اسے معاف کر دیا۔ نہ مجھے کسی سے عداوت ہے نہ کوئی برا لگتا ہے۔ میں کیا عجیب ہوں؟ میرا دل ان جذبوں سے پاک ہے۔ لیکن کوئی مجھے اتنا بتا دے کہ میرا بھائی کیوں مر گیا؟ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ جب ابّا کا انتقال ہوا تو اور بات تھی۔ خاصی عمر پا کر

خاندان کی پرورش سے فارغ ہو کر وہ سدھارے۔ ہمیں رنج ہوا، لیکن گھاؤ نہیں پہنچے۔ بھائی کی موت پر میں تلملا رہا ہوں۔ میرے دل پر کچوکے لگ رہے ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ کس کو ہم سے دشمنی تھی۔ ہمارا دشمن کون ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں؟"

سپنگلز دور تک سوچتا رہا۔

"میں نہیں جانتا کہ دشمن کون ہے۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ وہ ہم انسانوں میں سے نہیں ہے۔ اگر انسان دشمن ہوتا تو ہم سب کے سب خود اپنے آپ سے دشمنی کرتے۔ ساری دنیا کے انسان ایک جیسے ہیں۔ اگر انہیں ایک دوسرے سے عداوت ہے تو وہ خود اپنی ذات کے دشمن ہیں۔ انسان دوسروں سے نفرت نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ جب اسے اپنی ذات سے نفرت ہو جائے تو اسے چاہیے کہ یہاں سے نکل جائے۔ اپنا جسم چھوڑ دے، دنیا چھوڑ دے۔ تمہارا بھائی ایسا نہیں تھا۔ اسے زندگی سے محبّت تھی۔ وہ جینا چاہتا تھا۔ تمہارا بھائی زندہ رہے گا۔"

"کیسے؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ ایسے انسان کبھی نہیں مر سکتے۔

تمہارا بھائی یولی سیز کے روپ میں زندہ رہے گا۔ یہ محبّت اسے جیتا رکھے گی جو تمہیں اس سے تھی۔"

"نہیں نہیں۔ یہ سب تسلّیاں ہیں۔ یہ کافی نہیں۔ میں اپنے بھائی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آنکھوں کے سامنے رہے۔ میں اسے چھونا چاہتا ہوں۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں، اس کی آواز مجھے سامنے سنائی دے، اس کے قہقہے گونجیں، میں اس کے ساتھ کھیلوں، کُشتی لڑوں۔ اور اب۔ اب میرا بھائی کہیں نہیں ملے گا۔ عمر بھر ڈھونڈتا پھروں تب بھی اسے نہ پا سکوں گا۔ دنیا بدلی بدلی معلوم ہوتی ہے۔ دنیا میں بسنے والے بھی بدل گئے ہیں۔ یہاں میرا بھائی کبھی نہیں آئے گا۔"

وہ آبادی سے باہر نکل آئے تھے اور گھاس کے قطعے پر چل رہے تھے۔

"میں تمہیں دلاسے نہیں دے رہا ہوں، کیونکہ ایسے شدید غم میں سب تشفیاں بیکار ہیں۔ بس یہ یاد رکھنا کہ اچھائی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اچھا انسان کبھی نہیں مرتا۔ بارہا تم اسے دیکھو گے۔ کبھی وہ تمہیں گلیوں میں نظر آ جائے گا، کبھی مکانوں میں، کبھی آبادی اور ویرانوں میں، باغ میں، کُنج میں، دریا کے کنارے، بادلوں میں۔ جگہ جگہ دکھائی دے گا۔ ان تمام جذبوں میں اس کی یاد تحلیل ہو

جائے گی جو نفاست، حُسن اور پاکیزگی سے تخلیق ہوتے ہیں۔ جب بھی محبّت کا نور طلوع ہو گا تمہیں اس کا قرب محسوس ہو گا۔

اس کا جسم فنا ہو جائے لیکن اس کے وجود کا بہترین حصّہ زندہ رہے گا۔ محبت لافانی ہے۔ یہی حیاتِ جاودانی ہے۔ تمہیں کنکریوں کا کھیل آتا ہے؟"

"جی معمولی سا آتا ہے۔"

"تو پھر کنکریاں اکٹھی کرو۔ ایک بازی کھیلیں۔"

"جی بہت اچھا۔"

اختتام اور ابتدا

جو ٹرین ڈینی بوتھ اور ہنری رائف کو گھر لائی تھی اس سے ایک تیسرا سپاہی بھی اُترا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا قصبے میں پھر رہا تھا۔ دو قدم چل کر رُک جاتا۔ ہر چیز کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھتا اور اپنے آپ سے کہتا۔

"تو یہ اتھیکا ہے۔ یہ اس کی زمین ہے۔ وہ اس کا آسمان ہے۔ یہ سینما ہال جہاں اتھیکا کے رہنے والے قطار باندھے کھڑے ہیں۔ وہ لائبریری نظر آرہی ہے۔ گرجا۔ سکول۔ کھیل کا میدان اور اس کے سامنے ایرا کی دکان۔ یہ سانتا کلارا ایونیو آگیا۔ وہ گھر نظر آرہا ہے۔" سپاہی مکان کے سامنے کھڑا تھا۔

"یہاں امّی ہوں گی، بیس ہوگی اور ہومر اور یولی سیز۔ پڑوس میں میری اور اس کے ابّا مسٹر ایرینا ہوں گے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "اتھیکا میرے وطن، میرے عزیز گھر۔"

قصبے کی سیر سے اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔

"وہ پارک نظر آ رہا ہے جس میں لڑکے کھیل رہے ہیں۔ اس عمارت میں قیدی ہوں گے۔"

وہ چلتا چلتا دور نکل گیا اور اس جگہ سے گزرا جہاں سپنگلز اور ہومر کنکریاں کھیل رہے تھے۔ اندھیرے میں اچھی طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہار جیت سے بے خبر یہ کھیل میں مشغول تھے۔

ہومر نے دیکھا کہ ایک سپاہی کھڑا ہے۔ دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے پہلے سے جانتا ہے۔ اس سے کھیلا نہ گیا۔ وہ سیدھا سپاہی کے پاس گیا اور بولا۔ "معاف کیجئے۔ غالباً ہم دونوں پہلے بھی ملے ہیں۔"

"جی ہاں۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"کھیل میں شریک ہونا چاہیں تو میری جگہ لے لیں۔ ویسے اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"جی نہیں کھیلتے رہیے۔ میں تماشا دیکھوں گا۔"

ہومر سوچ میں پڑ گیا۔ "جی شاید میں آپ سے کبھی نہیں ملا۔ آپ اتھیکا میں رہتے ہیں؟"

"میں یہیں کا ہوں، آج ہی واپس گھر پہنچا ہوں۔"

"تو اب آپ یہیں رہا کریں گے؟ آپ کو لڑنے کے لیے تو نہیں بُلایا جائیگا؟"

"مجھے فوج سے چھٹی مل گئی ہے۔ دو گھنٹے ہوئے میں ٹرین سے اُترا ہوں۔ تب سے قصبے کی سیر کرتا رہا۔ سب جانی پہچانی جگہیں دربارہ دیکھیں۔"

"تو آپ اپنے گھر کیوں نہیں جاتے؟ اپنے عزیزوں کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دینا چاہتے؟"

"میں گھر ضرور جاؤں گا۔ عزیزوں کو اطلاع بھی دوں گا۔ لیکن سب کچھ آہستہ آہستہ ہو گا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا کہ میں واقعی یہاں پہنچ گیا ہوں۔ اِدھر اُدھر پھروں گا۔ کچھ دیر سیر کر کے پھر گھر جاؤں گا۔"

وہ لنگڑاتا ہوا چل دیا۔ ہومر سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر سپاہی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر سپنگلز سے بولا۔

"خبر نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں اسے جانتا ہوں۔ مسٹر سپنگلز کھیل ختم نہ کر دیں۔ جی نہیں چاہ رہا۔"

"اچھا۔" سپنگلز نے کنکریاں پھینک دیں۔

"میں کیا کروں؟ انہیں کیا بتاؤں؟ کھانے پر میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ وہ مجھے دیکھتے

ہی بھانپ جائیں گے۔ میں تو کچھ نہیں بتاؤں گا مگر وہ فوراً سمجھ لیں گے۔"

"ابھی گھر مت جاؤ۔ تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو۔ کچھ وقت لگے گا۔" دونوں چپ چاپ بنچ پر بیٹھے تھے۔ ایک طویل وقفے کے بعد ہومر بولا۔ "میں کس چیز کا انتظار کر رہا ہوں؟"

"تم منتظر ہو کہ اس کے وجود کا وہ حصّہ جو فنا ہو چکا ہے وہ تم میں بھی مر جائے۔ وہ حصّہ جو خاک سے بنتا ہے اور خاک میں مل جاتا ہے۔ تم موت کا کرب محسوس کر رہے ہو۔ اس لیے ابھی انتظار کرو۔ جانکنی کی اذیت ختم ہو چکے گی تو اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرو گے۔ جب تک زندگی ہے، ایسے عذاب آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا جائے گا تمہاری روح ایک نئی جلا سے آشنا ہو گی۔ زندگی کی لطیف ترین چیزوں سے قریب ہوتے چلے جاؤ گے۔ اس وقت صبر و تحمل کی ضرورت ہے تاکہ جب گھر پہنچو تو تمہارے ساتھ موت کا سایہ نہ ہو۔ ابھی ہم دونوں یہاں بیٹھ کر انتظار کریں گے۔"

سپنگلز اور ہومر گھاس کے وسیع قطع میں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔

میکالے خاندان کے گھر سے نغموں کی صدائیں آ رہی تھی۔ روح پرور، تسکین پہنچانے والے نغمے فضاؤں میں مرتعش تھے۔ جو عورت بربط بجا رہی تھی۔ اس کا

چہرہ محبّت اور شفقت کے نور سے روشن تھا۔ جس لڑکی کی انگلیاں پانی کے پروں پر رقصاں تھیں اس کے دل میں معصومیت تھی، خلوص تھا۔ گانے والی کی حلیم طبیعت اس کی آواز سے عیاں تھی۔

چھوٹا بچّہ انہماک سے سُن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اسے اس کی صداقت پر پورا یقین ہے۔

دروازے کے باہر سیڑھیوں پر ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ وہ ابھی ابھی اپنے گھر پہنچا تھا۔ گھر جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اندر اس کا خاندان تھا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے وطن میں پہنچ گیا ہے۔ یہ گھر ہے اور یہ عزیز و اقارب ہیں۔

یولی سیز نے اسے دیکھ لیا، اپنی بہن کو بتایا۔ اس نے والدہ سے کہا۔ ”امّی سیڑھیوں پر کوئی بیٹھا ہے۔“

”اسے اندر بلا لو۔ جاؤ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔“

”اندر آجایئے، آپ کو امّی بلاتی ہیں۔“

سپاہی نے مُڑ کر دیکھا۔

"تم بیس ہو۔ یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔ میں گھبرایا ہوا ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ۔"

لڑکی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"آپ کون ہیں اور آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ لیکن تم بیس ہو۔ میں تمہاری والدہ کو جانتا ہوں، تمہارے بھائیوں کو جانتا ہوں۔"

"آپ میرے بھائی مارکس کو جانتے ہیں؟"

"ہاں تمہارے بھائی نے مجھے زندگی بخشی، گھر بخشا، کنبہ عطا کیا۔ وہ مجھے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

"وہ کہاں ہیں؟ اور آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟"

سپاہی نے مارکس کی دی ہوئی انگوٹھی نکالی۔

"یہ مارکس نے تمہارے لیے بھیجی ہے۔"

لڑکی خاموش ہو گئی۔

"بھائی جان مر گئے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں بیس، میں قسم کھاتا ہوں کہ مارکس نہیں مرا۔ وہ زندہ ہے۔"

ہومر صحن میں داخل ہوا۔ بیس دوڑ کر اس کے پاس پہنچی۔

"ہومر انہیں بھائی مارکس نے بھیجا ہے۔ دیر سے یہ ہماری سیڑھیوں پر بیٹھے ہیں۔"

لڑکی اندر چلی گئی۔

ہومر نے ٹوبی جارج کو پہچان لیا۔

"آپ کا نام ٹوبی ہے۔ پارک میں آپ ہی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

سپاہی نے سر ہلایا۔

"سہ پہر کو خبر پہنچ گئی تھی۔ تار میری جیب میں رکھا ہے۔ بتایئے اب کیا کریں؟"

"ہومر یہ خبر غلط ہے۔ تار کو پھاڑ کر پھینک دو۔"

ہومر نے جیب سے لفافہ نکالا اور اس کے پرزے پرزے کر دیئے۔ پھر کچھ

سوچ کر کاغذ کے ٹکڑوں کو جیب میں ڈال لیا۔

"ہومر مجھے سہارا دو۔ میں خود اُٹھ نہیں سکتا۔"

ہومر نے ٹوبی کا بازو تھام لیا۔ یتیم بے گھر ٹوبی ہومر کے کندھے کا سہارا لے کر اُٹھا۔

"امّی۔" ہومر کی آواز میں غم کی رمق تک نہ تھی۔

"امّی! ہم گیت سنیں گے۔ آج سپاہی واپس گھر آیا ہے اس کا استقبال کیجئے۔"

موسیقی شروع ہو گئی۔ "میں چاہتا ہوں کہ کچھ دیر یہیں کھڑا رہوں۔" ٹوبی بولا۔

ہومر اور ٹوبی کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ٹوبی اپنے دل کے غم کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہومر کو ایک نامعلوم تسکین محسوس ہو رہی تھی۔

میری گیت گانے لگی۔

ننھا یولی سیز باہر آیا اور سپاہی کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ گیت ختم ہوا تو مسز میکالے، بیس اور میری آکر دروازے میں کھڑی ہو گئیں۔

ماں چپ چاپ کھڑی اپنے لڑکوں کو دیکھ رہی تھی جو اب دو رہ گئے تھے۔

اجنبی درمیان میں کھڑا تھا۔ ایک طرف ہومر تھا۔ دوسری طرف یولی سیز۔

اجنبی جو اس کے مرحوم بیٹے کا دوست تھا مُسکرایا۔

ماں کی غم زدہ آنکھوں میں روشنی آگئی۔ وہ مسکرانے لگی۔

آج اس کا پردیسی واپس آگیا تھا۔ اس کا مارکس لوٹ آیا تھا۔

ماں اپنے تینوں بیٹوں کو لے کر گھر میں چلی گئی۔

ختم شد